سیرۃ النبی ﷺ

ہفتم

مولانا سید سلیمان ندوی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

سلسلۂ دارالمصنفین

(نمبر ۱۳۷)

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جلد ہفتم

مشتمل بر معاملات و اسلام میں حکومت کی حیثیت عہد نبوی میں
نظام حکومت اور سلطنت و دین کا تعلق وغیرہ

—: تالیف :—

مولانا سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

نام کتاب	سیرۃ النبی جلد ہفتم
نام مصنف	مولانا سید سلیمان ندوی رح
صفحات	۱۹۴
طبع ہشتم	اپریل سنہ ۱۹۹۲ء
قیمت	۳۵ روپیے
طابع	معارف پریس اعظم گڈھ
ناشر	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ
	۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین
وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ؕ

سیرۃ النبی اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاعِ گرانمایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں، بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنیکے مرادف ہے، ع

مادح خورشید مداح خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انھوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ وسلام کی سیرت طیبہ، حالات و واقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدیؐ، تعلیمات نبویؐ اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے، انھوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلیؒ کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے، دلائل و معجزات اور منصب نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثت محمدیؐ اور سیرت نبویؐ کی وسعت و جامعیت، اس کی بے خطا رہبری

و رہنمائی اور عہد میں حیاتِ انسانی و نسلِ آدم کے لئے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لئے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحبؒ کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیمات بوی پر یک "دائرۃ المعارف" (انسائیکلوپیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی، لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انھوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرۃ النبی کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات، وسعتِ نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و تورع، شریعتِ اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت دین کے اولین و مستند ترین مآخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی اور فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبویؐ کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجمانی ہوتی، افراط و تفریط سے پاک، تجدد و آزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی، اور اس میں ان صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنۂ جواب رہتے ہیں، اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہو

(جس کی نظیر گذشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی، اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہوجاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیاتِ مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی، قلم میں خطباتِ مدراس اور سیرۃ النبیؐ کی جلد سوم، چہارم، پنجم وششم کا زور اور آبشارِ علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بناء پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضاء اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہمہ وقت موقع اور فراغ خاطر باقی نہیں رہا تھا، اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل اور غیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا: لیکن ایک مبصر وماہر فن اور ایک استاد وکہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کرلیتا ہے، اور اس کے اجمال میں سیکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصلِ مطالعہ ہوتا ہے جس کی قدر وقیمت کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو، اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرۃ النبیؐ کے میخانے کے میخوار اور سید صاحب کے تحریرات وتحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لئے جو متفرق مضامین ومباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیور طبع سے آراستہ ہوجاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں کے قارئین وعشاق اپنی پیاس بجھاتے، اور اپنے قلب ونظر کو روشن کرتے، خدا کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے

حصول کا بھی موقع ملا، اور انھوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کے نام سے شائع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے، لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے، اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر ونظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گے، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور انھوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے، اس لئے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا، اس لئے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہو گا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علماء کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے[1]۔"

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

[1] سیرۃ النبی ج ۷، مقدمہ ص ۵، ۶

"اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز ۲ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا، اور پھر رک جانا پڑا، ۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ہے"[1]

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آگئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آسکتی ہیں، مثلاً اس کتاب میں "معاملات" کی تعریف اسکے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے۔ "میزان" کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے، سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی وانقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدت مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکز ارشاد سے تعلق تھا وہ نہ صرف سیاست وحکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح وتربیت کے لئے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا، ایسی صورت میں، ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری میزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت وسلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہانتک کہ کتاب ونبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے"[2]

---

[1] سیرۃ النبی ج ۷ مقدمہ ص ۶ [2] مقدمہ: ص ۲۳؛

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بینات بھی جمع کر دیئے ہیں، اور یہ سیرت نبوی ص کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے، لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا، اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتی ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اسطرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

"اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع واحکام اور حقوق و فرائض اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکے، اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے"۔[1]

اور اس کی تائید کے لئے وہ سورۂ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دینِ مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن وامان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہبِ سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی انکی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی انکے سامنے ہے جو تفریقِ دین و سیاست کی قائل تھی، اور اسکے متعلق انکے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبال نے صحیح کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی　　　سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں　　　کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

[1] مقدمہ ص ۴۷

اس لئے خطباتِ مدراس اور رسولِ وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے:

"اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لیکر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اسکے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمراں ہے، وہی زمین پر فرماں روا ہے۔"

وَهُوَالَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ — اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ
وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰه. — اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔[1]

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انھوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافتِ اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہو گئی ہے، نیز وہ موجودہ دور کے قیام حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لئے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے، نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اسکے لئے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔"[2]

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاسیات اور نظمِ حکومت کا پورا حصہ آجاتا تو وہ اس عظیم خلاء کو

---

[1] مقدمہ ص ۴۹، [2] ایضاً ص ۶۳،

بہترین طریقے پر پُر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اسکے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں "نقش سلیمانی" ہے، اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثار قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگار نبوی، متکلم اسلام اور نابغۂ عصر استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبیؐ کی کسی جلد پر یہ ہیچمدان پیش لفظ لکھے، لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے، اس لئے اس پر ایک "ناقص" کا کچھ لکھنا محلِ تعجب نہیں کہ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ابوالحسن علی ندوی

۲۸ مئی ۱۹۸۰ء ۱۱ رجب ۱۴۰۰ھ

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی
کہ محرم نیست خسرو راز باں در گفت و گوئے تو

دارالمصنفین، اعظم گڑھ ہیچمدان مور سلیمان

۲۳ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ، ۷ جولائی ۱۹۸۰ء سید صباح الدین عبدالرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الطَّاھِرِیْنَ

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے

معاملات کے حدود معاملات کا اطلاق فقہا نے حقوق عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے، مثلاً بعض فقہاء شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے' یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے' اور یا امور دنیا سے ان کا تعلق ہوگا' تو ان کی تین قسمیں ہیں' اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین سے متعلق ہیں' اشخاص کی بقاء مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید و فروخت و اجارہ و رہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقاء مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح و طلاق و خلع و تفریق وغیرہ) اور اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقاء ہے تو انکو عقوبات کہیں گے[۱] (جیسے قصاص و سزا و تعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی' جن پر

[۱] کشاف' اصطلاحات الفنون' احمد تھانوی' مطبوعہ کلکتہ ج ۱' ص ۲۳ بحوالہ توضیح و تلویح۔

دین و دنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین و دنیا میں فساد راہ پائے گا، اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ قسمیں کی ہیں، **عبادات** جیسے نماز، روزہ وغیرہ، اور **عادات** جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام، اور تیسری چیز **معاملات** ہے، جس سے مقصود نسل و نفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز **جنایات** ہے، جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجرا، اس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے، جیسے قصاص وحدود و تعزیرات،

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن عابدین نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر منقسم ہے معاوضات مالیہ (بیع و فروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح و طلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے، اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتل نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبرو ریزی پر زجر، کسی کی پردہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

معاملات سے ہماری مراد | لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکامِ شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوق عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔

آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے، اس کی حفاظت و مصلحت کے

قوانین کا نام سیاست ہے، لیکن ہمارے قدیم فقہاء نے اس کے لئے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد اس میں امارت و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آجاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے الاحکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۴۵۰ھ اور الاحکام السلطانیہ قاضی ابو یعلی حنبلی المتوفی ۴۵۸ھ، لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ و خراج و زکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ اور اسی لئے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کرکے ان کا نام کتاب الاموال یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال ابو عبید بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ، اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ، اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ، اہل سنت کے نزدیک گو امامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے، تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کردیئے جاتے ہیں، جن میں امامت کے شرائط اور طریقِ انتخاب، اسکی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرز بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے لئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی، اسی لئے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی اور مباحث میں رد و بدل اور نئی ضرورتوں کے لئے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت، مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر

ہوا ہے جن سے دو، یا دو سے زاید افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان کے ضابطوں اور قانونوں کی تفصیل ہو، ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں، تو حسب ذیل تین قسمیں ہوسکتی ہیں، معاشریات، اقتصادیات اور سیاسیات، اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں، اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے، معاشریات میں نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی و تجارتی کاروبار کا بیان آجائے گا، اور سیاسیات میں حکومت و سلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہونگے

اس کام کا اشکال یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں، اور فقہاء نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس لئے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کردینا ہوتا تو کام آسان تھا، مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے، اور خصوصاً اسلئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدماء کی کتابیں نصًّا اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کرلے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے، مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبویؐ کے سیاسیات کے احکام و فرائض کا ماخذ

خود ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے، یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال، ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی، اور بارہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گو ، رجمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیئے، دو سال کے بعد ۲۹ ر رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴ ر شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا۔ اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي (طٰہٰ ۲۵ تا ۲۸)

دیگر مذاہب اور معاملات دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کئے ہیں، تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے، لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے، ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اسکی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں، مگر شائد بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے، تاہم یہ سب قومیں اپنے قانون کا ماخذ علم الٰہی اور علم مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنھوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحی الٰہی کے بجائے عقل انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ و قیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے، اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلانِ طبع قانون کا معیار ہے، کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے، اور

افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے، یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا و ہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا و ہوس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانینِ جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے، اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی، قوم اور غیر قوم، امیر اور غریب سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمیندار، طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں، جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معرضِ بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے اسکا فیصلہ کیا جاتا ہے، اور اسکو جمہور کیلئے آیۂ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی اس جوش و خروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیۂ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بیک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے، پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے، اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے، اور تیسری، اور چوتھی، اور پانچویں آتی ہے، اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے، ان تمام تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے، ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچ

یا ایک کو پہونچتا ہے اور دوسرے کو نہیں، تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے، اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے، اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گذر جاتی ہے، اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح اور عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری

ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا، اس لئے قدم قدم پر اس کے چلانے والے کے ذاتی مفاد سے وہ ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص و طمع، غرور و تکبر، ہوا و ہوس، رشوت اور انتفاع ناجائز، خوف و ہراس اور مکر و حیلہ کے بیسیوں خلاف انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف کی میزان ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔

قانون الٰہی کی ضرورت

اسی سبب سے مصلحت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل و انصاف کی یہ میزان خود دستِ الٰہی میں ہو، جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں، کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لئے ہے، اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے، جس کو اپنے لئے اور اپنی غرض کے لئے کچھ نہیں چاہیئے، جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں، جاری کر رکھا ہے، اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں جاری فرمائے، جو تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَ الۡمِیۡزَانَ (شوریٰ ۱۷)	وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔

وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ (حدید ۲۵)

اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔

کتاب اور میزان میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل وانصاف اور حق کی میزان ہے، جس سے سارا نظام کائنات تُل رہا ہے، اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں، چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

اَلرَّحۡمٰنُ ۝ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ۝ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ ۝ اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۝ وَّالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ يَسۡجُدٰنِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الۡمِيۡزَانَ ۝ اَلَّا تَطۡغَوۡا فِى الۡمِيۡزَانِ ۝ وَاَقِيۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِيۡزَانَ ۝ (رحمٰن ۱-۹)

رحمت والا (خدا) جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں، اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیر فرمان ہیں، اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی تاکہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کیساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم صحیح اور غلط ہے، اس لئے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ دیکھو یہ قصد و ارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت

طبعی طور سے قصد و ارادہ کے بغیر کس طرح عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام و اصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد و ارادہ کی دولت ونعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد و ارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ۔ (انعام-۲۵۲)	اور ناپ اور تول کو پورا کرتے رہو۔
فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ۔ (اعراف-۸۵)	تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔
اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ (ہود-۸۵)	ناپ اور تول کو پورا کرو،
وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ۔ (ہود-۸۴)	ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں،

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیاء بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں[1] ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لئے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لئے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لئے دوسری ترازو سے، اس ستم پیشہ پر خدا کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

[1] تفسیر طبری میں آیات میزان سورۂ حدید اور سورۂ رحمان وغیرہ میں دیکھئے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ	پھٹکار ہے ان کم کر دینے والوں پر
اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ	جو اپنے لئے لوگوں سے ناپ پوری
يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ	لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر
اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ.	یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے
(تطفیف ۱ - ۲)	ہیں۔

معاملاتِ انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورۂ حدید میں زمین میں قیام عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا	اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی
بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ	نشانیوں کے ساتھ بھیجا، اور ان
الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ	پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری
بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ	اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ
بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ	انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے
لِلنَّاسِ.	لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے
(حدید ۲۵)	اور لوگوں کیلئے کئی فائدے ہیں۔

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب، یعنی احکام الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار کے دل میں دھری ہے، اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے، اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکام الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں، ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے

ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے، اور اسی کے دوسرے ہاتھ میں قانون الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہیئے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الٰہی کی دائمی یکسانی

قانون الٰہی کے نظریہ پر ایک شبہہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے، اس لئے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہیئے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیونکہ شے نہیں بدلتی، اس کے رنگ شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں، جس طرح مادیت کے اصول طبعی کبھی نہیں بدلتے (اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ) گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے، اور ٹھنڈی ٹھنڈی، آگ برف نہیں بنتی، برف آگ نہیں، روشنی تاریکی نہیں، تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے، رات اور دن پے درپے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھڑی، پلک اور لمحے دم بہ دم بدل رہے ہیں، سال پر سال آتے ہیں، مگر چاند اور سورج وہی ہیں، ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں، جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب و گل کی دنیا پر حکمراں تھا، آج بھی وہی ہے، اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی نہ چودھویں صدی، پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔

یعنی خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔ (فتح-۲۳)	خدا کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا۔

فطری حقوق اور معاملات کی یکسانی

ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی و معاشرتی قوانین

اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا نیکی بدی نہیں بنتی، بدی نیکی نہیں، سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا، جھوٹ سچ نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، دوسروں کی چیز ناحق لینا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، دوسروں کی عزت اور آبرو کو داغ لگانا، دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا، حقِ قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا، کسی کی جائداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا، لین دین میں طرفین کی رضامندی، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام، اخلاق سوز حرکات کی بندش، فتنہ و فساد کا انسداد، ظالمانہ طریقوں کی ممانعت ہر عہد میں ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے، جب کبھی کوئی قانون بنا ہے، یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزاء رہے ہیں، اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزاء برقرار رہیں گے، البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لئے قانونِ الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل ہر مجموعۂ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جزء کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت، کہیں وطنی افادیت کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے، اس لئے اس مجموعۂ قانون میں اسی بنیادی نقطۂ غرض کی لکیریں اُبھری نظر آتی ہیں، جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے، وہاں کالے گورے، یوروپین اور نیٹو کے اصول پر کارفرمائی ہے، جہاں وطن قانون کی اساس ہے، وہاں جغرافی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں، اور رومی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری

ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیئے ہیں، یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا بیج بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے، بہاری یو پی میں جگہ نہیں پاسکتا اور یو پی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے، فیشزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے، اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت کے لئے زمین سے فتنہ و فساد کا دفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے[۱]، چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود و تعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے فتنہ و فساد کا دفع ہے، اور جس قدر معاملات و معاشرت کے اصول اور مسائل ہیں، ان کا مبنیٰ بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام ہے، اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں، ان سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع و فریب کا استیصال ہے۔

اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف زبان اور لغت اور تہذیب و تمدن کا کوئی فرق اور ملک و اقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے، یہ قانون خدا کا ہے، خدا کے سارے بندوں کے لئے بنایا گیا ہے، وہ چاہے کالے ہوں یا گورے، آریائی ہوں یا سامی، یورپی ہوں

---

[۱] علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام، اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں۔

یا ایشیائی، ہندی ہوں یا حجازی عجمی ہوں یا تاتاری، سب کے لئے یکساں اور سب کے لئے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق بے شبہہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اسکے اس قانون کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں، اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں، ایک وہ جو اس قانون کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدائے واحد و برحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں، مسلمان ہیں، دوسرے وہ لوگ اس خاص قانون الٰہی کو نہیں مانتے، لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الٰہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اسوقت ہو، مانتے ہیں، ان کا نام ذمی ہے، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جنکے پاس انکا مانا ہوا قانون الٰہی اب بھی انکے مانے ہوئے صحیفۂ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانون الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں، یہ شبہ کتابی ہیں، چوتھی وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفۂ الٰہی سے نا آشنا اور ہر قانون الٰہی سے محروم ہیں، ان کو مشرک کہتے ہیں، قانون الٰہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہہ بعض امتیازات ہیں، جنکی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ **معاملات** کے حدود کیا ہیں اور ان کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں، تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپکے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لئے ایک عاملانہ طاقت و قوت کا وجود ضروری ہے جو ہر چیز کو احکامِ شرع اور نظامِ عدل کے مطابق قائم رکھے، اس بحث کے دو ضروری جزء ہیں۔

۱۔ اس عاملانہ طاقت و قوت کی ضرورت "حقیقت"، اس کے شرائط و اوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

۲۔ معاملاتِ انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام، اور اس کے اسرار و مصالح۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لیکر آئے، آپؐ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوش خبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی، تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضاجوئی بے خوف وخطر کی جاسکے اور اس کے لئے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا (نور ۵۵)	خدا نے ان سے جو ایمان لائے، اور اچھے عمل کئے، (یہ وعدہ کیا کہ) وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا، جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لئے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جما دیگا اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا، میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لئے، خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اسی ایک خدا کا ہو جائے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ	اور ان سے لڑتے رہو، یہانتک کہ
وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔	فساد نہ رہے، اور سب حکم
(انفال ۳۹)	اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعاء یہ بتائی ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً	اے ہمارے پروردگار! ہمکو دنیا میں
وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ	بھلائی دے، اور آخرت میں
قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔	بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے
(بقرہ ۲۰۱)	عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم و عبادت، تندرستی، روزی، مال و دولت، فتح و نصرت اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے، دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا۔

لِلَّذِينَ اَحْسَنُوا فِي هٰذِهِ	اور جنھوں نے نیک کام کئے
الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ	ان کے لئے دنیا میں بھلائی ہے
الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ	اور آخرت کا گھر سب سے
دَارُ الْمُتَّقِينَ۔	اچھا ہے، اور پرہیزگاروں کا
(نحل ۳۰)	گھر کیسا اچھا ہے،

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی، ان کو بشارت ہے۔

فَاٰتٰھُمُ اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَۃِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (آل عمران ۱۴۸)	تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہاں کی نعمتیں بخشیں۔

وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا فِی اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّھُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ۔ (نحل۔ ۴۱)	اور جنھوں نے گھر چھوڑا خدا کیلئے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

وَاکْتُبْ لَنَا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ۔ (اعراف۔ ۱۵۶)	اور (اے خدا) ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائدار ہے، اس لئے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو،

ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

(ہود ۱۵-۱۶)

جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں، اور کمی نہیں کی جاتی، یہ وہ ہیں جنکے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا، اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِىْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۔

(شوریٰ ۲۰)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں،

مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ

(آل عمران ۱۴۵)

جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا، اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور شکر گذاروں کو ہم پورا انعام دیں گے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔ (بنی اسرائیل ۱۸-۱۹)

جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دیدیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں، پھر ہم نے اس کے لئے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر، ڈھکیلا جاکر، اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کی اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جنکی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (نساء ۱۳۴)

تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اسکو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہانوں کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلب گار ہے، اس کے لئے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی، مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کیلئے بند ہو جائیگا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہانتک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی

وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا (ہود ۵۴)	اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں۔

یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ	اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے
عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ	احسان کو یاد کرو، جب تم میں نبی
وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا۔ (مائدہ ۲۰)	بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی۔

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ	بے شبہ خدا نے طالوت کو تمہارا
طَالُوْتَ مَلِكًا (بقرہ ۲۴۷)	بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا۔

وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ	اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت
(بقرہ ۲۴۷)	دیدے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ	اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں
خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ (ص ۲۶)	بادشاہ بنایا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعاء فرمائی۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ	اے میرے پروردگار! میری
مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ	مغفرت کر اور مجھکو ایسی
مِّنْۢ بَعْدِیْ	بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد
(ص ۳۵)	کسی کو شایاں نہ ہو۔

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہے، دے، اور جس سے چاہے چھین لے۔

اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی	اے اللہ! اے سلطنت کے مالک
الْمُلْکَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ	تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور
الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ (آل عمران ۲۶)	جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنا دیا ہے،

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ	بے شک زمین کے مالک میرے
الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِیْ ھٰذَا	صالح بندے ہوتے ہیں، اس
لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۔	اعلان میں خدا کے فرماں بردار
(الانبیاء ۱۰۵-۱۰۶)	لوگوں کے لئے پیام ہے۔

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے، فرمایا

وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ	اور البتہ خدا اس کی مدد کرے گا
اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ اَلَّذِیْنَ	جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ
اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا	زبردست قوت والا ہے، وہ کہ ہم
الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا	اگر ان کو زمین میں جما دیں تو وہ
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ	نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے
الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ	کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے
الْاُمُوْرِ	روکیں، اور ہر کام کا انجام خدا کے
(حج ۴۰-۴۱)	اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ

پہلے خود اچھا ہو گا، اور برے کاموں سے باز رہنا ہو گا۔

خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کیلئے اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیئے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا۔

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (نور ۲)

ورتم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کیلئے تیار ہونا چاہیئے۔

فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (بقرہ ۲۷۹)

تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کیلئے خبردار ہو جاؤ۔

اس لئے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اسکی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا[1] جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں، لوٹ مار کریں، قرآن اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہتا ہے، اور اسکی سزا قتل، پھانسی، قطع ید اور قید یا جلا وطنی ہے، اور انکی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہتا ہے

[1] ابو داؤد، باب اخذ الجزیہ

ذَالِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ	یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

(مائدہ ۳۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں تسلّی دی۔

اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔	خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو، زمین تو خدا کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا توڑرنے والوں کا ہے،

(اعراف ۱۲۸)

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلّی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، اُلٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا،

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔	قریب ہے کہ تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے، اور اسکی جگہ تمھیں زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔

(اعراف ۱۲۹)

آخر جب وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام و بےکس قوم خلافت الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ	اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور

الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا۔ (اعراف ۱۳۷)	پچھم کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت دی ہے، اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی انکے صبر کی وجہ سے۔

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی، لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منھ پھیرنے لگے، تو دفعۃً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا۔ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا۔ إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا، فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ	اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کروگے اور بڑی سرکشی کروگے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا، تو وہ ملک میں گھس گئے، اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے، پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا، اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی، اور تمھاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کروگے تو اپنے لئے، اور برا کروگے تو اپنا، پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو

لِيَسُوْٓءُا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۔	اوروں کو تم پر ابھارا تاکہ تمھارے منھ بگاڑ دیں، اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں، جیسے (تمھارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں
(بنی اسرائیل ۴-۷)	اسے تباہ کردیں۔

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کئے گئے ہیں، وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کیلئے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انھیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی خدا کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی خدا کا وہی برتاؤ ہوگا۔

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انھیں پہلے ہی ہشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الٰہی کی پیروی کی جائے گی، جب تم ان سے منھ پھیروگے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منھ پھیر لے گی، چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں دونوں موقعے پیش آئے، اور دو دفعہ ان کی شامت اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ بنوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں، اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا، ظالم بادشاہوں کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی، چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا۔ (بنی اسرائیل ۸-۹)	امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کریگا، اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے، تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے، اور ہم نے جہنم کو کافروں کیلئے قید خانہ بنا رکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے، اور مومنوں کو، جو نیک عمل کرتے ہیں، بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہو گئی، کیونکہ انھیں سنا دیا گیا۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ ۴۰)	تم میرا وعدہ پورا کرو، تو میں تمھارا وعدہ پورا کروں گا۔

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيمُوا	کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ	کہنا، اور نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے
تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ	رہنا، تو چند شخصوں کے سوا تم سب
مُعْرِضُونَ. وَاِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ	(اس عہد سے) منھ پھیر بیٹھے اور
لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ	جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں
وَلَا تُخْرِجُونَ اَنْفُسَكُمْ	کشت و خون نہ کرنا اور اپنے کو انکے
مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ	وطن سے نہ نکالنا، تو تم نے اقرار
وَاَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ثُمَّ	کرلیا، اور تم (اس بات کے) گواہ ہو
اَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ	پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر
اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ	دیتے ہو، اور اپنے میں سے بعض
فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ	لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی
تَظٰهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ	کر کے انھیں وطن سے نکال بھی
وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ	دیتے ہو، اگر وہ تمھارے پاس قید
يَّاْتُوكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوهُمْ	ہو کر آئیں تو بدلہ دیکر ان کو چھڑا بھی
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ	لیتے ہو، حالانکہ ان کا نکال دینا ہی
اِخْرَاجُهُمْ. اَفَتُؤْمِنُونَ	تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) ہے
بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ	کہ تم کتاب (خدا) کے بعض احکام
بِبَعْضٍ ج	کو مانتے ہو اور بعض سے انکار
(بقرہ ۸۳-۸۵)	کیے دیتے ہو۔

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لئے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیا اور فرمایا۔

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ
مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ
يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ
(بقرہ ۸۵)

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں،
ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی
ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو
اور قیامت کے دن سخت سے سخت
عذاب میں ڈال دیئے جائیں۔

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصًا بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنادی گئی۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ
اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ
وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ
مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا
اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا
خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○
(بقرۃ-۱۱۴)

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے
جو خدا کی مسجدوں میں خدا کے نام کا
ذکر کئے جانے کو منع کرے اور انکی
ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو
کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں،
مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے
دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں
بڑا عذاب ہے۔

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہوں اور خدا کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں انکے لئے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے، انکو سولیوں پر لٹکایا جائے، انکے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، انکو ملک سے باہر قید کر دیا جائے،

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا
وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ○ (مائدہ ۳۳)

یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے، اور
آخرت میں ان کے لئے بڑا (بھاری)
عذاب (تیار) ہے۔

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنھوں نے کتابِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنالیا تھا، یہ سزا سنادی گئی،

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ	دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

(مائدہ ۴۲)

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنیاد پر دین میں کج بحثی کرتے ہیں اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منھ پھیرتے ہیں، انکے لئے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ ثَانِيَ عِطْفِهِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ	اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا (کی شان) میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتابِ روشن کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے تاکہ (لوگوں کو) خدا کے راستے سے گمراہ کردے، اسکے لئے دنیا میں ذلت ہے، اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتش سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔

(حج ۸-۹)

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ علیہ السّلام کو وحیِ الٰہی نے خبردار کردیا،

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِنْ	(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا، ان پر پروردگار کا

رَبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُفْتَرِيْنَ۔ (اعراف ۱۵۲)	غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افترا پردازوں کو ایسی ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ ہمیشہ کیلئے ذلت، قومی مسکنت اور غضب الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے، کیونکہ انھوں نے احکام الٰہی سے انحراف کیا، خدا کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدود الٰہی کو توڑتے رہے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ. ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ (بقرہ ۶۱)	اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (وبے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی، اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوگئے، یہ اس لئے کہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اس کے) نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اسلئے کہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

آخر الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لئے مہلت کا آخری موقع تھا لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم رہی، اس پر خدانے قیامت تک کے لئے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْآ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ	یہ جہاں نظر آئیں گے، ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے بجز اسکے کہ

وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ (آلِ عمران ۱۱۲)	یہ خدا اور لوگوں کی پناہ میں آجائیں، اور یہ لوگ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے یہ اس لئے کہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے یہ اس لئے کہ یہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔
دوسری سورہ میں ہے وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (اعراف ۱۶۷)	اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمھارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلّط رکھے گا جو ان کو بُری بُری تکلیفیں دیتے رہیں، بیشک تمھارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے تاریخ کا کون سا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انھوں نے اپنے کئے کی سزا نہیں پائی ہے، اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب، ذلت، نکبت اور مسکنت کی تفسیر

"جزیہ" یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے، قرآن پاک کی دعا میں ہے،

اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی	اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو
الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ	جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے
الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ	چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت
تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ	دے اور جس کو چاہے ذلت دے،
بِیَدِکَ الْخَیْرُ (آل عمران ۲۶)	تیرے ہاتھ ہی میں بھلائی ہے۔

ان آیتوں میں لف و نشر مرتب ہے، یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا، اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں، بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے، احکام الٰہی سے انحراف، انبیاء و مصلحین امت کا قتل و تکذیب، حرص و طمع سود خواری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور خدا کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ	(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے
سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ	کو (معبود) بنا لیا تھا، ان پر پروردگار
وَذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا	کا غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی
وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ	زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی)، ہم
(اعراف ۱۵۲)	افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچہ کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر اس مفتری کے لئے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی

جبہہ سائی کرے گا اور ارض و سماء کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں دربدر پھرے گا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئیگا۔

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ	اور جس کو (اس کے اعمال کی پاداش میں) خدا رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔
(حج ۱۸)	

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت — بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اسکے اعتراف کا نام شروع میں ایمان، اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عملِ صالح ہے، اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینھ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابلتا ہے، خدا نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا:۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ	اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں،

لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ ۶۵-۶۶)	ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انھوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (اعراف ۹۶)	اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے، مگر انھوں نے تو تکذیب کی، سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے انکو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (نور ۵۵)	جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ (فتح ۲۰)	خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم انکو حاصل کروگے، سو اس نے غنیمت کی تمھارے لئے جلدی فرمائی۔

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لئے ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ	مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں
عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ	جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے
اَلِیْمٍ. تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ	(وہ یہ کہ) خدا اور اس کے رسول پر
وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال
بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط ذٰلِکُمْ	اور اپنی جان سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو
خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، وہ تمہارے
یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ	گناہ بخش دیگا اور تم کو باغہائے جنت
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ	میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور
وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ	پاکیزہ مکانات میں جو بہشتہائے جاودانی
عَدْنٍ ط ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ	میں (تیار) ہیں، داخل کریگا، یہ بڑی
وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا نَصْرٌ مِّنَ	کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو
اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ط وَبَشِّرِ	تم بہت چاہتے ہو (یعنی تمہیں) خدا
الْمُؤْمِنِیْنَ o	کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح
	قریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی
(الصف ۱۰-۱۳)	خوشخبری سنا دو۔

یہ فتح و نصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی، اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دین الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ۔

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ	وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو
بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ	ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا،

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ	تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام
(توبہ ۳۳)	دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورۂ فتح و سورۂ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے، یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آئندہ پوری ہونا ہے، اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے لیکن اس کے پورے ہونے کے لئے مسلمانوں پر سعی و کوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لئے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ	اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک
وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔	کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے
(انفال ۳۹)	اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے

سارا حکم خدا کے لئے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی و جسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو، وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اسکی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے،

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	(اے پیغمبر!) جب مومن تم سے

اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ	توخدا ان سے خوش ہوا اور جو صدق
السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ	وخلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے
فَتْحًا قَرِيْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً	معلوم کرلیا، توان پر تسلی نازل فرمائی
يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا	اور انھیں جلد فتح عنایت کی، بہت سی
حَكِيْمًا۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ	غنیمتیں جو انھوں نے حاصل کیں، اور
كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ	خدا غالب حکمت والا ہے، خدا نے
لَكُمْ هٰذِهٖ وَاُخْرٰى	تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا
لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ	کہ تم ان کو حاصل کروگے، تو اس نے
اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ	غنیمت کی تمھارے لئے جلدی فرمائی اور
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔	اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں
	رکھتے تھے، اور وہ خدا ہی کی قدرت
(فتح ۱۸-۲۱)	میں تھیں، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح و غنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے، وہ خیبر کی فتح ہے، جو بیعت رضواں کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی، اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے، چنانچہ اس سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا	(اے محمد) ہم نے تم کو فتح دی،
(فتح - ۱)	فتح بھی صریح اور صاف۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے

آپ کو اس فتح و نصرت کے وعدہ کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ	جب اللہ کی مدد اور فتح آچکی اور
وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ	تم نے دیکھا کہ لوگ خدا کے دین میں
فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ	گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تو
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو اور
(نصر ۱-۳)	اس سے مغفرت چاہو۔

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی طاعات اور عبادات کی دعوت، فرائض و حقوق کی ادائگی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہونچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہونچ گیا، اس موقع پر ایک شبہہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا، اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع و حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کرسکیں، اسلئے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا

فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ	وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادیگا
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ	اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ	پسند کیا ہے، مستحکم و پائدار کرے گا، اور
خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ	خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ	میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ
(نور ۵۵)	کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لئے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا، اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے، اس کی مسجد اس کا دیوان، اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہوگیا تو آپ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا[1]، کیونکہ آپ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی بادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، وفد رؤسائے قریش کی گفتگو۔

خدائے واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا، اسی لئے اسلام دین و دنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اوّل ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شاہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمراں ہے اور وہی زمین پر فرماں روا ہے

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلٰهٌ	اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ
وَفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ (زخرف ۸۴)	ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے،

وہ دیبیوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لئے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیبی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا، اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ، جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لئے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ ہے[1]، مسلمانوں کو ہشیار کیا جاتا ہے،

وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْأَرْضِ	(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہونگے
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ	جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی
يُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ۔	کی تلاش میں، اور وہ لوگ ہوں گے
(مزمل ۲۰)	جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔

[1] بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اوّل و آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل، و بیہقی و حاکم و احمد۔

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانہ میں سنائی جارہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ و سنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئیگی گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سر بکف میدان میں آنا ہوگا،

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی، سنو! اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمھارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمھارے لئے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ، اور اگر تمھیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمھیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمھارے فیصلہ کے بغیر ہم کوئی کام نہ کریں گے، اور اگر تمھیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فصلت کی آیتیں پڑھیں، جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آگیا، اور واپس آکر قریش سے کہا کہ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ شاعری ہے، نہ جادو ہے، اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منھ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لئے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہوکر عرب پر غالب آگئے تو ان کی بادشاہی تمھاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمھاری ہی عزت ہوگی، اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کردیں گے، تمھیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہکر کہ محمدؐ نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کردیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے ملکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کی،

"اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے، تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو، تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ، اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں، اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں، اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔

یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہئے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے، مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے، اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ تم کو اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لوگے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا، اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آجائے۔"

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہوگیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی، اس کے لئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی

وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح، عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آجاتی تھی، اور اسی لئے اس کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابو طالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صلح ہو جائے، ابو طالب بھتیجے سے کہتے ہیں: جانِ عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں، وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں، اور کچھ وہ تم کو دینا چاہتے ہیں۔ ارشاد ہوا: اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم ان کے زیر نگیں ہوگا، ابو جہل نے کہا: ہم آپ کی ایک بات نہیں، دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں، اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ[1]

حج کے موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جاکر توحید کی دعوت دیتے ہیں، اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں: "اے لوگو! کہو خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمھاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمھارے تابع فرمان ہوگا، اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے[2]"

بیعتِ عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپکر رسول انام علیہ السلام کے دستِ مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھکر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے، اسعد بن زرارہ انصاری

---

[1] سیرت ابن ہشام، [2] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۴۵ لائیڈن۔

رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب وعجم بلکہ جن وبشر سے اس کے لئے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہو گا اس کو اس سے چھیننے کے لئے جھگڑا نہ کرو گے، اور جس سے تم اپنی اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہو، میری بھی کرو گے، انصار نے ایک آواز سے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آپؐ کی یہ سب باتیں منظور، لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت اور فتح ونصرت[1]۔

گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین ودنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے، اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی، اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لئے عرب وعجم بلکہ جن وبشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا، اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا، یہانتک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی، مختلف موقعوں پر صحابہؓ کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوشخبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انھیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے

[1] طبقات ابن سعد جزء ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳ لائیڈن۔

تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا' اور دنیا کی بادشاہیاں انکے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں دم بدم خبریں آرہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آرہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جان نثار صحابہؓ بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آجاتا ہے جسکو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں، حضورؐ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری نکلتی ہے، جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں، اور حضورؐ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں: اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے، مدائن تمھارے ہاتھ آئیگا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمھارے تصرف میں آئیں گے مصر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمھاری فوجوں کا میدانِ جہاد اور بحرِ روم تمھارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی[1]

[1] ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی جلد سوم میں پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

لیکن ان خوشخبریوں، بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہئے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے موانع کو دور کرنے میں معین ہیں، اور اسلام کے حدود اور قانون عدل وانصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت، شان وشوکت اور مال ودولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش وعشرت یہ دولت وحشمت اور جاہ ومال، سوء مآل کا موجب ہو جائے گا، اسی لئے ضروری ہے کہ کر وفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت وحشمت، اور مال ودولت دنیا کی نہیں، بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لئے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ کھیتی دنیا کے لئے ہے، تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی، اور اگر آخرت کے لئے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کیلئے فوز وفلاح کا موجب ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ	جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو
نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ	اس کو ہم اس میں دے دیں گے، اور
يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا	جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو
وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ	ہم اس میں سے دے دیں گے اور اسکا
(شوریٰ ۲۰)	آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔
وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا	اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا
نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ	بدلہ چاہے اسکو ہم یہیں بدلہ دیدیں گے
ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا	اور جو آخرت میں طالب ہو، اسکو وہاں

وَسَنَجْزِی الشَّاکِرِیْنَ
(آل عمران ۱۴۵)

اجر عطا کریں گے، اور ہم شکر گذاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے،

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولتِ فانی کے پیچھے دولتِ باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت آرام وراحت اور دولت وسلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب ونعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ۔
(نحل ۴۱)

اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے لئے وطن چھوڑا، ہم انکو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ۔ (توبہ ۳۸)

کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَزِیْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (قصص ۶۰)

اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو خدا کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے کیا تم سمجھتے نہیں

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی۔
(اعلیٰ ۱۶-۱۷)

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے،

وَالدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (اعراف ۱۶۹)	اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۔ (زمر ۲۶)	پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے، کاش یہ سمجھ رکھتے۔
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی (طٰہٰ ۱۲۷)	اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔

اگر آخرت کا خیال کئے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کرلے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَهُمْ فِیْهَا لَا یُبْخَسُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (ہود ۱۵-۱۶)	جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انھیں دنیا ہی میں دیدیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی، یہ وہ لوگ ہیں جنکے لئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو عمل انھوں نے دنیا میں کئے، سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرکاہ سے بھی کمتر ہے۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (توبہ ۳۸)

دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ۔ (رعد ۲۶)

اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (آل عمران ۱۸۵، حدید ۲۰)

اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لئے برتنا چاہئے جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے:

اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ

دنیا تمھارے لئے پیدا کی گئی ہے، اور تم آخرت کیلئے پیدا کئے گئے ہو۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لئے ہیں:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (بقرہ ۲۹)

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں، تمھارے لئے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ اور خود انسان کس لئے بنا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذاریات ۵۶)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لئے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کا ذریعہ بنایا جائے، دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت

اسی لئے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

وَابْتَغِ فِیْ مَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ	اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے
الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ	اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے
الدُّنْیَا۔　(قصص ۔ ۷۷)	اپنا حصہ مت بھول۔

انہی معنوں میں الدُّنیا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے،

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح وکامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے ہمارے مقصد کو واضح کرنے کیلئے کافی ہیں، فرمایا گیا:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ	کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے
فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ	کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دیگا، جیسا ان سے
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ	پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے
لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی	دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند
لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ	کیا ہے، مستحکم وپائدار کرے گا، اور خوف
بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ط	کے بعد امن بخشے گا، وہ میری عبادت
یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ	کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو
بِیْ شَیْئًا ط وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ	شریک نہ بنائیں گے، اور جو اس کے بعد
ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ	کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں، اور
الْفٰسِقُوْنَ ۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ	اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو،

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (نور ۵۵-۵۶)	اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

خدا نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، "تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پروا ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میرے احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں، اور اگر اس امن و اطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا، نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (حج ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں، اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں، اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے انسداد کا اہتمام کر سکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول، نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اسکے لئے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے

عہدِ نبوی میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی، چنانچہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سرپرغرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے، اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آکر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت

قائم کی تھی جس کے فرماں روا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آگیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اسقدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظامِ سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور نظام تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظامِ زندگی کا تخیل انکے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا اس کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے، بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو، بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانون الٰہی کی اطاعت و فرماں برداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اسی طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے آئے تھے، مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	تمکو بیچ کی امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا	بتانے والے بنو اور رسول تمہارا
(بقرہ ۱۴۳)	بتانے والا بنے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لئے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و رہنمائی اور انکی تعلیم و تربیت کیلئے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا، اور آپ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح و ہدایت کے نذر ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لئے آمادہ تھے، اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ کو قبیلہ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا، لیکن آپ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دار الہجرۃ بنایا، وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پُرخطر تھا اور ابتداء میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لئے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظام اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آگیا اس بنا پر اسلام کے دائرہ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور

سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصوں میں بھی یہی طریقہ دعوت اختیار فرمایا چنانچہ سب سے پہلے قرب و جوار کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کرلینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبولِ اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدمِ قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا، اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہوچکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصع اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہِ حبش نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے تمام رؤسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کرلیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہوسکا تاہم غزوۂ تبوک نے آپ کے جانشینوں کے لئے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کردیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظامِ حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

اَلْیَوْمَ اِسْتَدَارَ الزَّمَانُ کَھَیْئَتِہٖ	زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آگیا جس پر
یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	وہ اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظامہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا

اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی :

اِذَا ھَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ	جب کسریٰ ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد
وَاِذَا ھَلَکَ قَیْصَرُ فَلَا قَیْصَرَ	کوئی کسریٰ نہیں، اور جب قیصر ہلاک
بَعْدَہٗ۔	ہوگیا تو اسکے بعد کوئی قیصر نہیں،

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون، جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھی، یا اس کو یوں کہئے کہ نظام اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگراں و حاکم ہے، شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کہ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ۔ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا، یہی مطلب ہے، اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے،

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر، ہزاروں گھروں کو ویران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر

اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظام سلطنت کی جد وجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمح نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا صرف ایک شہنشاہ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرماں روا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جد وجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریقِ حکومت اور عدل وانصاف اور احکام کے حق و باطل سے ہو۔

اسی مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لئے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے، اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا، اور اس کے لئے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی، اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظام سلطنت کو مٹانے کے لئے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی، عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم

واستقلال، زلزلہ انگیز قوتِ ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومتِ اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں، اور ان اوصاف کی جلاء، اخلاص، للّٰہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاق روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لئے اوّلاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب واقتدار اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لئے اختیار کر رکھا تھا، مذکورۂ بالا اخلاقی محاسن کے وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشود نما کی صورت ایک ہی تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامور من اللہ، ایک پاکباز رہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتوِ صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکام الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں:

(۱) یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

(۲) یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا احساس اوّلین محض اخلاص قلب اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظام سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا، اس نظام سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر آکر کھڑے ہو گئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہل کار حکام حقوق میں

عام مسلمانوں کے برابر کر دیئے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کیلئے کوئی نئی چیز نہ تھی، کیونکہ اہل عرب فطرۃً خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی، قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کئے جاتے تھے، لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سرداران قبائل کے لئے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فضول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے، عام مجالس میں لوگوں کو سرداران قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا، کہتا ہے:

ونُنكِر ان شئنا على الناس قولهم ✽ ولا ينكرون القول حين نقول

اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں ✽ اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے

سرداران قبائل اپنے لئے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے:

لا حمى الا حمى الله ورسوله . . . . اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے

اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے، ان کے امراو علیٰ قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لئے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کئے گئے، سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لئے ناجائز ٹھہرے، امام وقت اور اس کے حکام کے لئے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش و نقیب رخصت کر دیئے گئے، طلائی و نقرئی و زمردیں تخت اٹھوا دیئے گئے، امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے، اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع و لباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام صحابہؓ میں کسی قسم کا فرقِ مراتب موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لیکر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے، آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لئے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی، جس کے شاہانِ وقت عادی تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے، آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد کون ہیں، لوگ اشارہ سے بتاتے، صحابہؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے جس پر آپ جلوہ افروز ہوں، مگر اسکو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اسکا رسول اور اہل بیت رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لئے دوہری سزا ہے، ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہؓ کو یہ گراں گذرا اور انھوں نے آپ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی، آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اسکی سزا دی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو انکو چھوڑ دیتے تھے، پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اسکا ہاتھ کاٹتا۔[1]

ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا، آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا۔[2]

[1] یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے، مثلاً کراہتہ الشفاعۃ فی الحدود اذا رفع الی السلطان

[2] ابوداؤد ج ۲، ص ۱۵۸، کتاب الحدود۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہؓ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے، لیکن آپ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔[1] ابطالِ سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانونِ عام نافذ ہوا تو سب سے اوّل اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا، اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات و عشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندانِ نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بخلاف اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کاملہ ہی آپ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ وہی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ نے ان سب کو مٹا دیا، فرمایا: خدا کے نزدیک سب سے برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو شاہ شاہان کہے، ایک دفعہ آپ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: یہ تو اللہ کے لئے ہے، آپ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ کے صاحبزادہ ابراہیمؓ کا انتقال ہو چکا تھا، اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو

[1] ابوداؤد

سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لئے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم کی موت کی طرف منسوب کردیا، لیکن جب آپؐ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا۔[1]

ایک بار ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اسقدر رعبِ نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا، آپ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار آپ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمدؐ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپؐ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔[2] حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپ نماز پڑھا رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: "خداوندا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر" آپ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ "تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الٰہی کو محدود کر دیا"[3] حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطینِ زمانہ اکرام وانعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خاندانی عیش وآرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا، اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان

[1] بخاری باب الکسوف، [2] مسند ج ۳، ص ۴۳۵ مسند اسود بن الشریع، [3] بخاری ج ۲، ص ۸۸۹ کتاب الادب

سمجھتے تھے، لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ، یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے، اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لئے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرمادی اور اس کو بحکم الٰہی عام غرباء اور اہل حاجت کا حق قرار دیا، اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداؤد میں ہے:

قال ما اوتیکم من شیئ وما امنعکموہ ان انا الاخازن اضع حیث ما امرت[1]	میں تم کو نہ کچھ دے سکتا نہ کچھ روک سکتا ہوں، میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔

دوسرے موقع پر فرمایا:

انما انا قاسم واللہ یعطی	میں تو صرف بانٹنے والا ہوں، دینے والا تو خدا ہے۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضورؐ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضورؐ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مالِ غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گو براہ راست

[1] ابوداؤد ج ۲، ص ۱۵، کتاب الخراج والامارۃ۔

دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور اس کی آمدنی اپنے صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کے ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرما دیا تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لئے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے، چنانچہ انھیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی: اے اللہ کے نبیؐ! میں کیوں نہ روؤں، جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے، اُدھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور حضور اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ! دوسری روایت میں ہے

کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! دعاء فرمایئے کہ خدا آپ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیئے ہیں، آپ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: "کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو، رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیئے گئے ہیں[1]"

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھئے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گوڈری اور مرقعے[2] ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس بن سعدؓ ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے، اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انھوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپؐ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں[3]، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گذرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں! تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہئے[4]۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضورؐ کو سجدہ کیا، آپ نے حیرت سے فرمایا: معاذ! یہ کیا؟ عرض کی: یا رسول اللہ!

---

[1] بخاری و مسلم کتاب النکاح، باب الایلاء [2] یعنی پیوند دار کپڑا (معارف) [3،4] دیکھئے ابوداؤد کتاب النکاح

میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو دل چاہا کہ میں بھی حضور کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔[1]

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب وجوار کے سلاطین کی طرح عیش وآرام اور تزک واحتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار وترفع اور اسراف وتبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سربلندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی کی پیروی کی، اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا وبخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امراء کے موروثی استحقاق اور سعی وسفارش کی بنا پر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولتمندوں کی دولتمندی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولتمندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفاء کا حق اقویاء کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی

[1] ابن ماجہ کتاب النکاح۔

جس میں کچھ یمنی مہرے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کردیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے انکا حصہ دیا جاتا[۱]۔

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات و تصنعات اور غلامی و عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرفِ مدعا زبان پر آتا تھا، اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہ نبوت میں ایک طائر بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرضِ مدعا کرے، نا آشنا بدو آتا تو یا محمدؐ کہہ کر خطاب کرتا اور حضورؐ خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے، اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا، آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضورؐ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے، تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا، اور حضورؐ اس کو شفقت سے سنتے تھے، اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہؓ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں سفارش ہے، عرض کی تو قبول سے معذور ہوں[۲]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر

[۱] دونوں واقعے ابوداؤد، کتاب الخراج میں ہیں [۲] صحیح بخاری، باب تکون الحرۃ تحت العبد و باب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرہؓ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اور اگر آزاد ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے، انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے، بلکہ ہم کو بدر کے کنویں کے پاس آگے بڑھکر ٹھہرنا چاہئے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا، اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ

انتم اعلم بامور دنیاکم — تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لئے کرتے ہوں گے، اس لئے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گذر ہوا تو دریافت فرمایا، انھوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے، میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہی ہوں، تم آزاد ہو۔[1]

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن جن امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت خداوندی پر مبنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور کو بذریعۂ وحی ہوتی تو

[1] صحیح مسلم باب الفضائل

ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے، اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اسلئے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہو گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: بے شبہ ہوں، انھوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شبہ ہیں، انھوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا، انھوں نے کہا کہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انھوں نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے، لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انھوں نے بھی وہی جواب دیئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو انھوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا[1]، اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض و معروض کی، مگر حضورؐ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ ارادت ربانی سے کیا گیا تھا۔

اسی طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے

[1] بخاری ج ۱، ص ۳۸۰، کتاب الشروط۔

شدتِ شوقِ زیارت کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لئے ان کو حزن و ملال ہوا، اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا، جس سے انکی غرض یہ تھی کہ حضورؐ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے، لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحت ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گذرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، ام المومنینؓ نے چہرۂ مبارک پر آزردگی کا اثر پاکر سبب دریافت کیا، آپ نے واقعہ بیان فرمایا، حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، آپ خود اپنا احرام کھول دیں، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا شمع نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضورؐ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امر الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امور تجربیہ سے تھا، اس لئے اس پر بلا تامل عمل فرمایا[1]۔

---

[1] اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہہ نہ کرے کہ خدانہ خواستہ علم النفس کا یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان (استادوں) کو اسلئے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں، اس لئے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضورؐ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضورؐ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آب پاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا، قانونِ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنویں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے، لیکن آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آب پاشی کرلو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہوگئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آب پاشی کر کے پانی روک لو، یہانتک کہ کھیت کی مینڈ تک پہونچ جائے[1] یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسروں کے کھیتوں میں از خود چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا آیا، اور کہا کہ یا رسول اللہ انصاف فرمائیے!

---

[1] ابوداؤد کتاب الفقہ، جلد ۲، ص ۶۷

آپؐ نے فرمایا اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اگر آپؐ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑادوں، لیکن آپ نے ان کو روک دیا[1]، اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے، (یہ پیشین گوئی امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہونچ گئے تھے، اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے برے اسلوب سے بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفاء اور امرائے اسلام کے لئے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور فخر و غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمال و حکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں، اسلئے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمال نبوی کی شکایت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو، یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال سے فرمایا "ہاں! مظلوم کی بد دعاء سے بچتے رہنا کہ

---

[1] بخاری جلد اول، ص ۵۰۹ باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

ان کی دعاء اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی، اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو[1]"

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا، اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہو گئی آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیونکہ جو لادو گے وہ نہ تمھارا مال ہوگا اور نہ تمھارے باپ کا، حضور نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، اس کے بعد فرمایا: میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جبتک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے اس کا بدلہ نہ دو، مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں[2]

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہئے کیونکہ اس کا حق ہے، اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا[3]۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲، ص ۲۶۶، کتاب الزکوٰۃ، باب ارضاء السعاۃ [2] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب العلم، [3] ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان۔

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بدمعاملگی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں! اس کو چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ نے پھر فرمایا: اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے، اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپ نے ایک انصاریہ کے ہاں اسکو بھیجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے جب وہ چھوہارے لیکر پلٹا تو آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم و عفو اور حسن معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی، اور اچھی دی[1]۔

بہر حال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے، ان سے بڑھکر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعادِ ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی، اور سخت و سست کہکر کہا کہ "اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کرتے ہو" حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کر کے کہا، او خدا کے دشمن! تو

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۶، ص ۲۶۸۔

…ول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا:
! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہئے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے،
مجھ سے کہنا چاہئے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں، یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو
…شاد ہوا کہ جاؤ! اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس[۲] صاع کھجور کے اور زیادہ دیدو،
…ودی حلم و عفو کے اس پُراثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔[۱]

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا، اور وہ بھی موٹا اور …دہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام …ے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، …حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا …طلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے …ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ …اط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔[۲]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم …پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے … پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا، آپ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا، اور …املہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی، ذرا اسلام کے امیر … زمانہ کے سلاطین اور امراء کے غرور و تبختر سے ملائیے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی … گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے ہیں، اور ان کا قانون …س کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ

---

[۱] یہ روایت بیہقی ابن حبان، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند …ح ہے (شرح شفا، از شہاب خفاجی)، [۲] جامع ترمذی، کتاب البیوع۔

یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار وگیر سے برتر ہے، اس سے بھلا برا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم اور رائی و رعیت قانون کی دار وگیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا، اور آپ کی خدمتِ اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصلِ جہنم کر سکتی تھی، بایں ہمہ آپؐ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لئے تھا کہ آپ کا یہ اسوہ آیندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لئے عملی سبق ہو، اور اس کے لئے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے، تاکہ آیندہ آنے والے امراء اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں،

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں ان میں ایران نے کبھی ذات شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب، استفسا اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور رومہ میں کسی زمانہ میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں، لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراد کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا، اور نہ انکو امراد کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراد و حکام میں اس تواضع، اس خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا، اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاصِ قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا، اور وہ اس کے پجاری تھے، اور وہ اس دیوتا کے لئے سب کچھ

کر سکتے تھے' اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا' جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے' اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی' اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے' کہ یہ نفس امیر سے سوال واستفسار کی صورت نہیں ہے' بلکہ اس ذات اقدس سے ہے' جس کی خاک عقیدت مسلمانوں کی چشم ادب کا سُرمہ تھی' اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی' بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی' صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے' ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے' اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ مشورہ کرتے تھے' ایک تو اس لئے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے' اور دوسرے اس لئے کہ چونکہ آپ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا تھا' اس لئے آپ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفاء و امراء کیلئے مثال و نظیر کا کام دے' آپ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ، (آل عمران ۱۵۹) (اے رسول! امور سلطنت (جنگ و صلح میں) اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے'

چنانچہ حضورؐ نے اس پر بہ نفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی' انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے انکی مدح فرمائی اور انکی خصوصیت ظاہر کی کہ

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (شوریٰ ۳۸)

ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

اگرچہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع و استقراء سے معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، اور ان کی رایوں پر عمل کیا، اور اس کا منشاء صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لیں تاکہ مفید نتیجہ تک پہونچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہونچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا، بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے، تو آپ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ انھوں نے الصلوٰۃ جامعۃ کہکر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی[1] اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب

---

[1] مصنف عبدالرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب المراسیل لابی داؤد و فتح الباری ابن حجر و روض سہیلی، و زرقانی علی المواہب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان، نووی میں ہے (باقی صفحہ ۹۳ پر)

دیکھا[1] اور آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، چنانچہ آپؐ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلال رضؓ کو اذان دینے کا حکم دیا،

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدانِ جنگ کے قریب پہونچ کر آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہانتک کہ ایک انصاری رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہؐ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہدیں کہ تم اور تمہارا رب جاکر میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑے، ہم تو یہیں رہیں گے، خدا کی قسم اگر آپؐ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے، اس کے بعد جب آپ میدانِ جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جاکر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! آپ حسب فرمانِ الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں، یا حضورؐ کی یہ اپنی رائے ہے'؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے، اس پر انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہئے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے،' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہیں جاکر قیام فرمایا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کئے گئے تو آپؐ نے پھر تمام صحابہ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرزِ عمل اختیار کیا جائے لوگوں نے مختلف رائیں دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا[2]۔

(باقی ص ۹۲ کا) فشرعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذالک اما بوحی واما باجتہاد ہ صلی اللہ علیہ وسلم علی مذہب الجمہور فی جواز الاجتہاد لہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیس ہو عملا بمجرد المنام ہذا مما لا شک فیہ بلا خلاف [1] ابوداؤد و ترمذی باب بدء الاذان۔ [2] ترمذی ص ۵۰۲ کتاب التفسیر سورۂ انفال

احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبداللہ بن اُبیّ بن سلول منافقِ مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پرجوش جانثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہیئے اور حضورؐ کا صحابہ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا سامنا کرنا امورِ حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ حنین میں جب قبیلۂ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ ہمارا جو مالِ غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے آپؐ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا، ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپ نے ان کی درخواست قبول کرلی، اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کردوں، اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کردیں جس وقت پہلا مالِ غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا، تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ "یا رسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔" آپؐ نے ان کے اس عاجلانہ اظہارِ رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے، اور کون راضی نہیں ہے؟ اسلئے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام و عریف ہمارے پاس بھیجنا چاہیے، چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو انکی رضامندی کی اطلاع دی۔[1]

[1] ص ۹۴ پر دیکھئے

احادیث کی کتابوں کا استقصار کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہدِ مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے، اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیامِ سلطنت اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبۂ حیات کو جس میں تمام درندگی، بہیمیت، مکروفریب، دغل و سازش، ظلم و ستم اور جور و تعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ

السّلطان ظل اللہ فی الارض	یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے
یاوی الیہ کل مظلوم من	امن کا سایہ ہے جسکے دامن میں بندگانِ
عباد اللہ[1]	الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے،

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ

السّلطان العادل المتواضع	عادل اور متواضع حاکم زمین میں
ظل اللہ و رمحہ فی الارض[2]	خدا کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔

(صفحہ ۹۴ کا حوالہ) ابوداؤد، کتاب الجہاد و صحیح بخاری کتاب المغازی۔ [1] و [2] یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہؓ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیقؓ ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں، بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں تفصیل کیلئے دیکھئے المقاصد الحسنہ، سخاوی اور کشف الخفاء و مزیل الالتباس عطاء، حلبی لفظ سلطان، یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قدیم عربی میں 'السلطان' کے معنیٰ بادشاہ کے نہیں، بلکہ طاقت و قوت کے ہیں،

(بقیہ ص ۹۶ پر)

خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔"

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہو گئی اور ہر قسم کی بد دیانتی، خیانت، فریب سازش، تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہو گیا، امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لئے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بد عہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہئے، یہ سن کر انھوں نے اپنی فوج ہٹا لی۔[1]

(بقیہ ص ۹۵) جو انگریزی لفظ 'پاور' کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مرادف ہے، اس لئے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظام حکومت مخلوقات الٰہی کے آرام و آسائش کے لئے گویا زمین میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ عمال حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں، سلطان کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے حدیث میں ہے: السلطانُ ولی من لا ولی لہٗ یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے، یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے، اس لئے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا، بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔ [1] صحیح بخاری، باب فضل من ترک الفواحش۔

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گذاری، اور خراج کے وصول کرنے کے لئے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعتہً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کے خدع و فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری و نمائشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے، تمام ملک میں تعلیم عام ہو گئی ہے ہر فرد رموز سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلّم ہو گیا ہے، لیکن بایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا، مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لئے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے، اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لئے دی جاتی ہے، لیکن بااین ہمہ کوئی یوروپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے، اس لئے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے،

اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ وزکوٰۃ عرب کے لئے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس وغربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہؓ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ وزکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں عمال مقرر کر دیئے گئے تھے، تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر وسر رشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاکر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے روایت ہے:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتاہ قوم بصدقتھم قال اللھم صل علیٰ اٰل فلان، فاتاہ ابی بصدقتہ فقال اللھم صل علیٰ اٰل ابی اوفیٰ۔

(بخاری کتاب الزکوٰۃ ص ۲۰۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لیکر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوندا فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لیکر آئے، تو آپ نے فرمایا کہ خداوندا! ابواوفی کی آل پر رحمت بھیج!

حضرت عدی ابن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے، اور ان کو تمام قوم کی طرف سے

مرباع یعنی چوتھا ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سرداران قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلہ کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا:

ان اول صدقۃ بیضت وجہ	پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا
و وجوہ اصحابہ صدقۃ طی	چہرہ چمک اٹھا، قبیلہ طے کا صدقہ تھا
جئت بہا[1]	جس کو تم لے کر آئے تھے۔

قبیلۂ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا:

ھذہ صدقات قومنا[2]	یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی، حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جاکر بوجھ ڈھوتے تھے، اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لاکر صدقہ میں دیتے تھے[3]

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے، لیکن اس درجہ کم ہوگئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے، اور اس سے بڑھکر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے انکے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نور ایمان سے چمک اٹھتے تھے، اور اس داغ کو دھونے کے لئے بیتاب ہوجاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہ نبوت میں آکر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی

[1] مسلم ج ۲، کتاب الفضائل۔ [2] ایضاً۔ [3] صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ وکتاب الاجارۃ باب من اجر نفسہ۔

مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے' اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں' مثلاً چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں' زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں' یا سنگسار کیا جاتا ہے' تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے' اور یہی حکمت لوگوں میں اعتراف جرم کا جذبہ پیدا کرتی تھی اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے' اپنے جرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعز ابن مالک ایک صاحب تھے' انھوں نے لونڈی کے ساتھ زنا کیا' جب انھیں ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر از خود اس جرم کا اظہار کیا' اور عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجیے' (صحیح مسلم باب الرجم) یا رسول اللہ مجھ پر حد جاری فرمائی جائے' آپ نے ان کی طرف سے منھ پھیر لیا' انھوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے' مجھ پر حد جاری فرمائیے' اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے رہے' اور آپ اعراض فرماتے رہے' چوتھی بار آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہمبستر ہوئے؟ انھوں نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اسکے ساتھ مباشرت کی؟ انھوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا: کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انھوں نے کہا ہاں! ان تمام مراتب کے بعد آپؐ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا' جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا' بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر مارا اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے' انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا' شاید وہ توبہ کرتے اور خدا ان کی توبہ کو قبول کر لیتا[1]

اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا' کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ

[1] ابوداؤد ج ۲' ص ۵۴۳ و صحیح بخاری' کتاب الحدود۔

نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انھوں نے از خود اپنے تیمار داروں سے اسکا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، حضورؐ نے ان کی شدتِ علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی۔[1]

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے، جنھوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہم بستر نہیں ہوا، تو یہ گنہگار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے۔[2]

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمت اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضورؐ نے دیت ہی پر زور دیا، یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے، میری مغفرت کے لئے دعاء فرمائیے۔[3]

---

[1] ابوداؤد، باب فی اقامۃ الحد علی المریض　[2] ایضاً باب یصیب الرجل دون الجماع و صحیح بخاری حدود،

[3] ابوداؤد، کتاب الدیات۔

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حدِ فاصل قائم کردیتے ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لئے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہؓ نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجراء سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء واستغفار سے ان کے گناہ معاف ہوجائیں گے، دنیوی سلطنت میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہؓ نے ماعز پر اس لئے پتھر برسائے کہ انھوں نے حکم الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی، دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظامِ سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہوجاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہونچانے کے لئے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کرسکتی ہے، بڑے بڑے جرائم سے درگذر کرسکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرسکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہِ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کئے، جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہونچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انھوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہوچکی تھی، حاطبؓ ابن بلتعہ ایک صحابی تھے، انھوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا، خدا کے رسول

اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا کہ خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل واولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہیں تھا اس لئے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، آپؐ نے فرمایا: سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو، لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپؐ نے فرمایا: کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر خدا نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے،

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ — جو چاہو کرو۔

(سورہ حٰم سجدہ ۴۰)

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ شرکت بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی، اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قرار دیا جا سکتا ہے، سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دور اندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو

---

[1] بخاری ج ۲، کتاب المغازی، ص ۵۶۰۔

اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے، اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دار و مدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص و اعتماد کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب رضی اللہ عنہ بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

حسن الظن من حسن العبادۃ	حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

(ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۸)

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ.	بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

(سورہ حجرات ۱۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی اصول کے طور پر اسکی تعلیم دی ہے:

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم (حدیث)	جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم اوکدت ان تفسدھم. (حدیث)	حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا یا عنقریب برباد کر دوگے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں

اسی اصول پر عمل ہوتا رہا، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انھوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لئے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے، البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں [1]

دخین حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کے منشی تھے، انھوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لئے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ "درگذر کرو" دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترک شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ درگذر کرو، کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ،

من رای عورۃ فسترھا کان	جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا
کمن احیی موؤدۃ [2]	اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے
(حدیث)	جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچالیا
	جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے، ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لئے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے، اس مضمون میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمامتر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبیؐ میں ملتا ہے اس لئے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا

[1] یہ تمام حدیثیں ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النہی عن التجسس میں ہیں [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الستر علی المسلم

کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیئے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول، وسعت علم، حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگراں ہے، اس لئے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو، اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہو، اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے، اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے، اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کیلئے مضر اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطنت کی خوبیوں کا تمام تر دار و مدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، انکے جرائم کو ایک ایک کرکے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے، اور لوگ اس سے بچنے کے لئے جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلوتہی کرتے ہیں، اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے، اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، انکے گناہوں سے درگذر کرے، تو وہ اسکے پہلو میں سو جاتے ہیں، اس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کی محبت میں شرابور ہو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں

جان دے دیتے ہیں، پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں، مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کے معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہئے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے، بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتداء ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لئے لوگوں کو تکلیف مالایطاق دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو اور حاکم کے لئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انھوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ "یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمھارے عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔"

ابن خلدون نے ان سطروں میں جو آئین جہاں بانی پیش کیا ہے اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جاسکتا ہے، لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے، اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لئے

جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو' جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو' عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو' امیر و غریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں' مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے' اثبات جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگ دلی کی تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے' چنانچہ فرمایا:

ان اللہ یعذب الذین	بے شبہہ خدا ان لوگوں کو عذاب دیگا
یعذبون فی الدنیا۔	جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں'

صحابہؓ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحبت اٹھایا تھا' انھوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا' ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے ہیں' انھوں نے اس کی وجہ پوچھی' لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے' انھوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دیگا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔[1]

دنیوی حکمران لطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں' غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ

[1] مسلم ج ۲، ص ۳۹۷، کتاب الادب۔

ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوم کے آدمیوں پر ظلم کیا جارہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خمیر تھا، اور اس لئے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملات حکومت میں خود آپ کا طرز عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کردیں گے، مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیاضانہ طرز عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیئے، کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں[1] یعنی سزاؤں میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے، آپ نے پوچھا، کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے دریافت فرمایا: کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا: جاؤ خدا نے معاف کردیا[2]۔

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ کو اپنے کام کے لئے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی، ایک بار ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ نے فرمایا تم اپنے کام کے لئے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں، چنانچہ آپ اسکے

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۹، کتاب الحدود، [2] ابوداؤد، ج ۲، ص ۱۴۲، کتاب الحدود، جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لئے بحکم ان الحسنات یذہبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی

ساتھ گئے، اور اس کے کام کو انجام دیدیا۔ عدیؓ بن حاتم جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے، جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو انکو شک تھا کہ آیا حضورؐ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اٹھے کہ حضورؐ بادشاہ نہیں، کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ کی خدمت اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال وجواب کرتے تھے، اور حضورؐ ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا۔[۱] بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لئے انکو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے، ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے، اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انھوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا،[۲] لیکن آخر ایک رات[۳] کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انھوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کیا، آپؐ نے دوبار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟ انھوں نے

[۱] مسلم ج ۲، ص ۲۹۴، [۲] بخاری ج ۲، ص ۹۰۰، [۲] ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرمات شرعی سے تشبیہ دے دی جائے، جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں کے برابر ہے، اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔

[۳] اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

دونوں دفعہ جواب میں عرض کی: ہاں! ہاں! یا رسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا: ایک غلام آزاد کردو، انھوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں آپ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو، عرض کی یا رسول اللہ! جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپؐ نے فرمایا: تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو، عرض کی یا رسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپؐ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقۂ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ، وہ تم کو اسقدر کھجور دیگا کہ اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمھارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔[1]

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کردی تھی جس کی جھلک سلاطین دنیوی کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آسکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کئے گئے تو انہی خودسر سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کرلیا، اس کا

[1] ابوداؤد ج ۱ ص ۲۲۰، کتاب الطلاق۔

اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہد نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا، اور شریعت کے احکام پوچھے فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو، پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو، اتنا سوال وجواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم میں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہوگیا اگر سچا نکلا (بخاری، کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا، اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے کہا: زمین اور پہاڑ کس نے بنائے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے پھر کہا: ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: اللہ عزوجل نے، اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا، اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور ان میں فائدے رکھے، کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا: ہاں! اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں، اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا، کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا کیا خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: بے شک! پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ہاں سچ کہا، اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کہا: آپ کے قاصد نے

یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانۂ کعبہ کا حج کریں، فرمایا: ہاں! سچ کہا، عرض کی: اسکی قسم جس نے آپ کو بھیجا، کیا خدا نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا: ہاں! اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کرونگا، ارشاد ہوا: اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضورؐ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا: تم میں محمدؐ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں، اس نے کہا اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضورؐ نے فرمایا: ہاں کہو! اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا، اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا: جو چاہو پوچھو، اس نے کہا: میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا: خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! اس نے کہا: میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ آئے ہیں، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں، میں ضمام بن ثعلبہ ہوں۔ (بخاری کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے، اور شیفتگی وجاں نثاری کا ایک اور واقعہ سنیئے:

خیر! یہ واقعات تو ان بدؤوں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے، صحابۂ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار تھے، وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گذرے تو ان کے ساتھ بھی انھوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازبؓ ایک صحابی تھے، ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدؤوں میں پہونچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضورؐ کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے[1]

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدانِ جنگ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بڑا حصہ میدانِ جہاد ہی میں بسر ہوا ہے صحابہؓ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بنؓ شعبہ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپ کی ریشِ مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپ کی ریشِ مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعاب دہن بھی گرتا ہے تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کیلئے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کیلئے ٹوٹ پڑتے ہیں، جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے

[1] ابوداؤد، کتاب الحدود، ج ۲ ص ۱۴۹۔

لوگ ادب اور تعظیم سے آپؐ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظر جاہ وجلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں، جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپؐ انکو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے پیش دستی کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لئے لڑتا ہے، جب آپ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ تعظیماً آپ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے[1]۔

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپؐ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انھوں نے کہا:

ایانا ترید یا رسول اللہ والذی	یا رسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری
نفسی بیدہ لو امرتنا ان	طرف ہے، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں
نخیضہا البحر لاخضناہا ولو	میری جان ہے، اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس
امرتنا ان نضرب اکبادھا	سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو
الی برک الغماد لفعلنا۔	ہم ڈال دیں گے، اور اگر حکم ہو کہ ہم
	اپنی سواریوں سے برک الغماد[2] پر
(مسلم کتاب الجہاد باب غزوۂ بدر)	دھاوا کریں، تو ہم کر دیں گے۔

[1] بخاری ج ۱، ص ۳۷۰، کتاب الشروط [2] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

غزوۂ احد میں جب آپؐ نے کفار کی جمیعت کو ذرہ گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابو طلحہ رضؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپؐ کو روکا' اس سے زیادہ جوش محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے' انھوں نے کہا:

بابی انت وامی لا تشرف	میرے باپ ماں آپ پر قربان آپ
یصیبك سهم من سهام القوم	گردن بڑھا کر نہ دیکھئے' کہیں آپ کو
نحری دون نحرك۔[1]	کوئی تیر نہ لگ جائے' میرا سینہ آپکے
	سینہ کے سامنے ہے۔

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے واقعات تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے' تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا' چنانچہ غیر قوموں کو عمال نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا' تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں' فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لئے آپؐ نے حضرت عبد اللہ رضؓ بن رواحہ کو مقرر فرمایا' وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی' اس پر یہودیوں نے کہا "یہ تو بہت ہے" انھوں نے کہا: اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں' تم لوگ اس کا نصف لے لینا' اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

هذا الحق به تقوم السماء	انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف
والارض قد رضینا ان	سے آسمان و زمین قائم ہیں' جو کچھ
ناخذه بالذی قلت[2]	تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے
	پر راضی ہیں۔

[1] بخاری کتاب المغازی' غزوۂ احد۔ [2] ابوداؤد ج ۲' ص ۷۵' کتاب البیوع۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی لیکن انھوں نے کہا: اے دشمنانِ خدا! تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو محبوب ترین خلائق ہے، اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں، لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں۔[1]

[1] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۱۔

سلطنت اور دین کا تعلّق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علٰحدہ رکھا گیا، اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو[1]، اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں، اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علٰحدہ حدیں بنائی گئی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سلطنتیں خداپرستی، دینداری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں،

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین وضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دین الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا، اور وہ اسلام ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور

---

[1] انجیل۔

دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے، مگر سلطنت الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنت الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے جل شانہٗ و تعالیٰ اسمہٗ بادشاہی اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے، فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الٰہی ہو یا اس پر مبنی ہو، اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے، اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے، آپ کے احکام کی بجا آوری، عین احکام خدا کی بجا آوری ہے،

مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (نساء ۸۰)	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جو جانشین اور خلفاء ہوئے ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرماں روا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی، اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصیٰ امیری	جس نے میرے امیر کا کہا مانا اس نے میرا کہا مانا، جس نے میرے امیر کی

فقد عصانی[1] نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی'

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے' احکام الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے' یہانتک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا ہو' غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے' خدا کے لئے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسب حکم الٰہی کیا جائے' وہ دین ہے امام کی امامت' خلیفہ کی خلافت' راعی کی رعیت' والی کی ولایت' امیر کی امارت حاکم کی حکومت' رعایا کی نگرانی' قاضی کی دادگری' عمال کا عمل' سپاہی کا قتال' مجاہد کا جہاد' محاصل کی ادائی' امراء کی واجبی اطاعت' غرض سلطنت کے تمام متعلق شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسب احکامِ الٰہی اللہ کے لئے کیا جائے' وہ سب دین اور اطاعت اور موجب قربت ہے' سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی ہی میں مصروف رہیں' جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے' فرائض و واجبات و مؤکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں' حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورۂ ص میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے

---

[1] صحیح بخاری' کتاب الاحکام ج ۲' ص ۱۰۵۷' و صحیح مسلم کتاب الامارہ ج ۲' ص ۲۲۳ مصر۔

عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت، ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے، اور یہی احساس فرض ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا گیا۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ. فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ. يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ. وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔	اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) ان کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے انھوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا، تو ہم نے ان کو معاف کر دیا، اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤد! ہم نے تمکو زمین میں خلیفہ بنایا، تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔
(ص ۲۴-۲۶)	

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر اپنے عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسب احکام الٰہی فرائض خلافت کی ادائگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من امام یغلق بابہ دون ذوی الحاجۃ والخلۃ والمسکنۃ الا اغلق اللہ ابواب السماء دون خلتہ وحاجتہ ومسکنتہ[1]	جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کرلے گا۔
من ولی من امر المسلمین شیئاً فاحتجب دون خلتھم وحاجتھم وفقرھم وفاقتھم احتجب اللہ عز وجل یوم القیمۃ دون خلتہ وفاقتہ وحاجتہ وفقرہ[2]	جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔

خلفائے راشدینؓ نے ان احکام کی پیروی یہانتک کی کہ انھوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں کھڑی کی، اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لئے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں[3] کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لئے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگایا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہونچی تو انھوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمدؓ بن مسلمہ کو

---

[1] ترمذی ابواب الاحکام ۷، ۲۲۔ [2] مستدرک حاکم کتاب الاحکام، ج ۴ ص ۹۳ حیدر آباد۔

[3] چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لئے اذن کا حکم ہے، اس لئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفاء نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے، مگر عام پبلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

اس لئے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، وہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہونچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگادی، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا اور زادِ راہ دینا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے۔[1]

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد ورفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا کہ جو اہلِ حاجت پہونچے تو اس کی ضرورت سُن کر ان کو مطلع کردے۔[2]

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل وانصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجاآوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائضِ حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا	امانت والوں کی امانتیں انکے حوالے
وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ	کردیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ
اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ	کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو،
نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ	خدا تمھیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے،
كَانَ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا	بیشک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے،
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا	مومنو! خدا اور اس کے رسول کی
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي	فرماں برداری کرو اور جو کوئی تم میں
الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ	صاحب حکومت ہیں، ان کی بھی، اور
فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ	اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو

[1] ابن حنبل ج ۱ ص ۴۵ مصر، [2] ترمذی ابواب الاحکام۔

اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّ اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا۔ (نساء ۵۸-۵۹)	تو اگر خدا اور روزآخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے، اور اس کا مآل بھی اچھا ہے،

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں جسکی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے، اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ (رحمٰن ۹)	اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اس معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کیلئے تولتے ہو اسی پیمانہ سے اپنے لئے بھی تولو۔

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ وَاِذَا کَالُوۡھُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡھُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ (۱-۳)	پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلافِ انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ۔ (مائدہ ۴۲ وحجرات ۹)	اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ	اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
(آل عمران ۱۴۰)	
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ ۴۰)	بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

"ظلم" کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے، اور بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ ۴۷)	مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

الا ایہا الناس لا یقبل اللّٰہ صلوٰۃ	ہاں اے لوگو! جو امام، خدا نے جو قانون
امام حکم بغیر ما انزل اللّٰہ۔	اتارا ہے، اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے
(مستدرک ج ۴، ص ۸۹ کتاب الاحکام)	اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا،

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے اور اس لئے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت بارگاہِ الٰہی میں بے معنی ہے،

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے، جن سے یہ ظاہر

ہوتا ہے کہ حکومت و فرماں روائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لئے آخرت میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے، اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لئے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لئے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

الامام الذی علی الناس راع	وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے، وہ نگراں کار
ھو مسئول عن رعایتہ (صحیح بخاری	ہے، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص
ج ۲، ص ۱۰۵۷، کتاب الاحکام)	کے متعلق بازپرس ہوگی،

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گذر گیا، اس کے لئے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آسایش ہے، اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا۔

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے
فلم یحطھا بنصیحۃ الالم یجد	اور وہ اس کی خیر خواہی پوری نہ
رائحۃ الجنۃ (بخاری و مسلم حوالہ سابق)	کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا،

حضرت معقل رضی اللہ عنہ بن یسار ایک صحابی ہیں، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انھوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمھیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے:

ما من عبد یسترعیہ اللہ	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے
رعیۃ یموت یوم یموت وھو	وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ

عاش لرعیتہ الاحرم اللہ علیہ الجنۃ۔ (مسلم کتاب الامارہ)

اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کردے گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے، عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہونچ جاتے ہیں اور اس کو پیار سے خطاب کرکے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

انَّ شرَّ الرِّعاء الحطمۃُ (مسلم، کتاب الامارہ)

سب سے بُرا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے۔

تو تو ان میں سے نہ بن، اس نے کہا: آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بھوسی ہیں، فوراً بولے، کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاءؑ فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، نبوت مجھ پر ختم ہوگئی، البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی، صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ! تو ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا، پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فَاِنَّ اللّٰہَ سَائِلُھُمْ عَمَّا اِسْتَرْعَاھُمْ۔ (صحیح بخاری)

کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق بازپرس فرمائے گا، جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعاء فرمائی ہے۔

اللّٰھم من ولی من امر امتی شیئاً فشق علیھم فاشفق علیہ ومن ولی امر امتی شیئاً فرفق بھم فارفق بہ۔ (مسلم)	اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا، اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لیکر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں، اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرہ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے، ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

الا کُلُکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ فالامیر الذی علی الناس راعٍ وھو مسئول عن رعیتہ والرجل راعٍ علیٰ اھل بیتہ وھو مسئول عنھم والمرأۃ راعیۃ علی بیت بعلھا وولدہ وھی مسئولۃ عنھم والعبد راعٍ علی مال سیدہ وھو مسئول عنہ الا فکلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ (مسلم وصحیح بخاری)	ہاں! تم سب نگراں کار ہو، اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص ورعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگراں کار ہے اسکے زیر نگراں کے متعلق پرسش ہوگی، اور مرد اپنے گھر والوں کا نگراں کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائیگی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگراں ہے، اس سے انکے متعلق سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے، اس سے اسکی بابت پوچھا جائیگا، تو ہاں! ہشیار رہو، تم سب نگراں کار ہو اور تم سے اس کے زیر نگراں کے بابت بازپرس کی جائے گی۔

لفظ رعیت اس موقع پر ایک مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے، اور وہ رعیت ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں، یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا اور رعیۃ وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت، ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے، اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے، اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور پُر محبت معنوں میں آیا ہے، اور ظالم و سفاک امراء اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں، حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے

ان المقسطین عند اللہ علیٰ	بے شک انصاف کرنے والے (حکام
منابر من نور عن یمین الرحمٰن	و امراء) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے
عزوجل وکلتا یدیہ یمین	منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے
الذین یعدلون فی حکمھم	اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں
واھلیھم وما ولوا۔	یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے
(صحیح مسلم کتاب الامارہ)	لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں عادل ہوں

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے، جامع ترمذی میں ہے

ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ وادناھم منہ مجلسا امام عادل و ابغض الناس الی اللہ وابعدھم منہ مجلسا امام جائر۔	بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا، اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دور وہ امام ہوگا، جو ظالم ہو۔

(ترمذی ابواب الاحکام)

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، فرمایا:

ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم و ینصح الا لم یدخل معھم الجنۃ (صحیح مسلم کتاب الامارہ)	جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو، پھر وہ ان کے لئے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔
ما من وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللہ علیہ الجنۃ۔ (صحیح بخاری، کتاب الاحکام)	کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیر نگرانی جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت حرام ہے۔
انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ فان امر بتقوی اللہ وعدل فان لہ بذالک اجرا	امام ڈھال ہے، اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے

وان امر بغیرہ فان علیہ وزرًا۔ (نسائی کتاب البیعۃ)

تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا' اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لئے بڑی سزا ہے،

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت وولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزاء و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال' اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں' اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں' کیوں کہ یہاں دین کے معنی احکامِ الٰہی ہیں' یا قوانینِ الٰہی ہیں' یہ احکام الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں' اس بناء پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جزء ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دُنیا کا کام ہے جس سے اہل علم اور اہل اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہئے' حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش[1] رموز مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے' زیادہ شور و غل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں' تم کو ان سے کیا سروکار)

---

[1] حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ محمل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہئے' جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے' اگر کوئی (باقی ص ۱۳۲ پر)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراء کے لئے ہے، اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال وجہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضرات خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں اس کا مقصود اصلی احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراء ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (انفال ۱۵-۱۶)	اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا، اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کیلئے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے، ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔
وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ	اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں

(بقیہ ص ۱۳۱ کا) بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیئے۔

صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ	جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو
(بقرہ ۱۷۷)	خدا سے ڈرنے والے ہیں

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامت دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے، عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامت دین کی راہ میں خونِ شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے،

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ	تو جو لوگ میرے لئے وطن چھوڑ گئے اور
دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا	اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے
وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ	گئے اور لڑے اور قتل کئے گئے، میں
وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	ان کے گناہ دور کردونگا اور ان کو
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا	بہشتوں میں داخل کروں گا، جن کے
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ	نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہ، خدا کے
حُسْنُ الثَّوَابِ۔	ہاں سے بدلہ ہے، اور خدا کے ہاں
(آل عمران ۱۹۵)	اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورۂ نور میں ہے:

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ	اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے
دِيْنِ اللّٰهِ۔ (نور ۲)	دین میں تم کو رحم نہ آئے۔

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکامِ الٰہی کی تنفیذ و اجراء سے ہے،

اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ۔ (بقرہ ۱۹۳)

اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے، سورہ انفال کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (انفال ۳۹)

اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم و قانونِ الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام، یوسف) اَلَا لَهُ الْحُکْمُ (انعام)، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا۔ (نحل ۵۲)

اور اسی خدا کا ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی اطاعت ہے

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظمِ قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت و ملکیت کی حقیقت اب دین کی تشریح کے بعد حکومت و سلطنت و ولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش و تنعم کے ایوانِ زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمربند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواروں کے سایہ میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے

وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے

سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی و شہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیم محمدیؐ نے ان سب لفظوں سے جو جبر و قہر اور ظلم و ستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لئے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَٰهِ النَّاسِ (الناس ۱-۳)	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی،
الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ۔ (حشر ۲۳)	بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن و امان والا۔
فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ (مومنون ۱۱۶)	تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔
الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (جمعہ ۱)	بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا۔

یہ آیت قرآن پاک میں چھ جگہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو "الملک الحق" یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں

کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس "لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے "رب الناس" "لوگوں کا پالن ہار" بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا ہے تاکہ اسکے ساتھ اسکی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے، تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفتیں آئی ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم و سفاکی، قہر و جبر اور بے رحمی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضرور لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے، اسلام میں شاہِ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا:

اخنع الاسماء عند اللہ	سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک
رجل تسمی ملك الاملاك	یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔
(صحیح بخاری، کتاب الادب)	

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرز حکومت کے

فردِ عامل کا نام 'خلیفہ' اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے 'خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں' اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرماں روا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے' سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں' توراۃ میں یہ بیان صرف حضرت آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے' لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے' اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا' اس کا اصلی مقام بہشت ہونا' جزا و سزا کا راز' رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے' دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین دنیا میں اس کے فرائض' احکام الٰہی کی بجاآوری کی ضرورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے' پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں[1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔ (بقرہ ۳۰)	اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا' جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے' یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے، جو تمام بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے اس لئے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (بنی اسرائیل ۔ ۷)	ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قائم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (بقرہ ۳۸)	تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ رہنمائی آئے تو جو میری رہنمائی کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے،

سورۂ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ	اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا پھر تمہاری صورتیں بنائیں پھر فرشتوں سے

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ۔ (اعراف ۱۰-۱۱)	ہم نے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی، اس لیے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (انعام ۱۶۵)	اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے شبہہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں پہونچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوحؑ کی قوم کا جانشین فرمایا:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اعراف ۶۹)	اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوحؑ کے بعد جانشینی بخشی۔

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ	اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد

مِنْ بَعْدِ عَادٍ (اعراف ۷۴) | نیابت بخشی۔

حضرت ہودؑ اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ (ہود ۵۷) | تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ارشاد ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ (انعام ۱۳۳) | اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمھارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور ۵۵) | اللہ نے تم میں سے ان سے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام ۱۶۵) | اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے جانشین بنائے۔

سورۂ یونس میں تصریح ہے:۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ | اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو، جب انھوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں

رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ	اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے انکے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔
(یونس ۱۳-۱۴)	

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ۔	لیکن ان لوگوں نے ان (نوحؑ) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوحؑ) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو (طوفان سے) بچالیا اور انہیں
(یونس ۷۳)	(زمین میں) خلیفہ بنادیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ۔ (فاطر ۳۹)	وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنادیا، توجس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے،

حضرت داؤدؑ کو خلافت بخشی گئی:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ (ص ۲۶)	اے داؤدؑ! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خَلَفَ سے مشتق ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لئے ایک کی

غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو، غیبوبت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمایندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے، قرآن پاک میں ہے:

۱- فَخَلَفَ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ　　　تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

(اعراف ۱۶۹ و مریم ۵۹)

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

وَاخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ۔ (اعراف ۱۴۲)　　　میری قوم میں میرے جانشین یا نائب ہو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

۲- وَلَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ مَّلٰٓئِكَةً　　　اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو

فِی الۡاَرۡضِ یَخۡلُفُوۡنَ (زخرف ۶۰)　　　بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا، اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النیابة عن الغیر　　　خلافت کے معنی کسی کے نائب

اما لغیبۃ المنوب عنہ و اما لموتہ و اما لعجزہ و اما للتشریف المستخلف۔

(ص ۱۵۵ مصر)

ہونے کے ہیں، اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو، یا اس کی موت کے سبب سے ہو، یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لئے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں مفتی آلوسی زادہ صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنوں کے لئے مختلف قول نقل کئے ہیں، اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں لکھی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کردے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اسی کی جانشینی مراد ہوگی، اور جہاں تصریح نہیں ہے، وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (حدید ۷)

اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے،

اب اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لئے مفسرین دونوں طرف

گئے ہیں، کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے، اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اسکی طرف سے امور خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے، کشاف میں ہے:

ان الاموال التی فی ایدیکم انما ھی اموال اللہ بخلقه و انشاءہ لھا و انما مولکم ایاھا و مولکم للاستمتاع بھا وجعلکم خلفاء فی التصرف فیھا۔	وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے، (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے اسی نے تمہارے تمتع کے لئے اس کا تم کو مالک بنایا ہے، اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔

بیضاوی میں ہے:

من الاموال التی جعلکم اللہ خلفاء فی التصرف فیھا۔	وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

روح المعانی میں ہے:

جعلکم سبحانه خلفاء عنه عزّ وجلّ فی التصرف فیه من غیر ان تملکوہ حقیقةً	اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے، نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے

وکیل اور نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب میں سرعنوان ہے، یعنی

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ (بقرہ ۳۰)	اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرمارہا ہے، حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً مِّنِّیْ یَخْلُفُنِیْ فِی الْحُکْمِ بَیْنَ خَلْقِیْ۔	میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں،

اس کے بعد اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

ان اللہ تعالیٰ اخبر الملٰئکة انه جاعل فی الارض خلیفة له یحکم فیها بین خلقه بحکمه (ص ۱۰۴ مصر)	اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اسکے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد به آدم علیه السلام لانه کان خلیفة اللہ تعالیٰ	اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ اسکی زمین میں اللہ تعالیٰ کے

فی ارضہ وکذالک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض وسیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم وتنفیذ امرہ فیھم لاحاجۃ بہ تعالیٰ الی من ینوبہ بل لقصور قبضہ وتلقی امرہ بغیرہ بغیر وسط۔	خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گذری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافت الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے، اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں۔

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر انکی عدول حکمی، اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلۂ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات وفضائل جو بیان کئے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام

اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی، اور اگر اس توضیح سے کلام کلیۃً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے، جس کا آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہہ خود اپنا نائب بنانا متعین ہو جائیگا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں، جن سے آدم اور بنی آدم کے شرف وکرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (بنی اسرائیل ۷)

ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں، اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتیر مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (تین ۴)

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لئے بنا ہے، اور سب

اس کے کام میں لگے ہیں:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ. (جاثیہ ۱۳)	اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں، اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں،

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور اسی کے لئے پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے۔ مزید تشریح کے لئے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں

وَخَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ ۲۹)	اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمھارے لئے پیدا کیا۔
وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ. (نحل ۱۴)	اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمھارے) اختیار میں کیا۔
اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ (جاثیہ ۱۲)	اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمھارے قابو میں کر دیا۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ. (ابراہیم ۳۲)	اور کشتیوں (جہازوں) کو تمھارے زیر فرمان کر دیا۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (ابراہیم ۵)	اور نہروں کو بھی تمھارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے اور یہی خلافت الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین

وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ	اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو انھوں نے
یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور
الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا	اس سے ڈر گئے، اور انسان نے
	اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ ظالم
(احزاب ۲۷)	اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابتِ الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے، یہ امانتِ الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے، جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے، اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لئے عاریت ملے ہیں، یہ حدیث کہ فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے، اور مشہور قول تخلقوا باخلاق اللہ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گا کہ اسلام کا نظریۂ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہونچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی و روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ (میں نے انسان اور جن کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اسکی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعت الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

اُمّتِ مسلمہ کی بعثت

عقیدۂ خلافت کے رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابت الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمایندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کیلئے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے تو امت محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابتِ الٰہی کی نمایندہ ہے، اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمایندہ رہے گی، اسی لئے قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخرالامم ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی پچھلوں کے ہیں۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (۳۹-۴۰)	ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔
وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (جمعہ ۳)	اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی

نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ انبیاء کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انھوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انھوں نے عصر تک مزدوری کرکے کام چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا بخشا تو انھوں نے مغرب تک کام کرکے انجام تک پہونچا دیا اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے (کنز ۶۔ ۲۳۰)

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امتِ مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح بخاری[1] و مسلم و نسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے:

نحن الاٰخرون السابقون۔ • ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے،

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں، لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم، بیہقی اور نسائی میں بھی ہے (کنز ۶۔ ۲۳۰)

ابن ماجہ میں ہے، کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نحن آخر الامم (کنز ۶۔ ۲۳۰) ہم سب سے آخری امت ہیں۔

غرض ان آیات و احادیث سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ امتِ محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر۔

ـوت کی آخری امانت کی حامل ہے اس لئے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور ہل عذر کی حجت کا قاطع ہوگا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا، اب ظاہر ہے ہے کہ اس کے حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کر دیگا واس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے، مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کیلئے اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے ر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ـلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا، اس کے بعد ورا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، تو وہ بھی سباب و تدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہوگا، اسی لئے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لئے ـاملین قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا، اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں ں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا، اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں ں پورا ہوگا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں ـائم رہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۔ (اعراف ۱۸۱)	ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)

اہل تفسیر نے اس کو امت محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل

دونوں کیلئے ہے یعنی قیامت تک امت محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہیگا۔[1]

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کرکے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ	اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رکھونگا۔
(آل عمران ۵۵)	

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں[2]، مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں، گو گمراہ ہوں[3] بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں، اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبۂ عام حاصل ہو جائے، جیساکہ نزول مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے۔

لا يزال من امتي امة قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتى ياتي امر الله وهم على ذالك	میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت کو لیکر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ بگاڑ سکیں گے، یہانتک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آجائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔
(بخاری، علامات النبوۃ)	

۱؎ تفسیر خازن تفسیر آیت مذکورہ ۲؎ تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ ۳؎ تفسیر روح المعانی تفسیر آیت مذکو

لا یزال ناس من امتی ظاہرین حتی یاتیہم امر اللہ وہم ظاہرون (بخاری، علامات النبوۃ)	میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہانتک کہ خدا کی بات یعنی قیامت آجائے گی۔
لا یزال من امتی قوم ظاہرین علی الناس حتی یاتیہم امر اللہ (بخاری، کتاب التوحید)	میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہانتک کہ قیامت آجائے گی،
لا یزال من امتی امۃ قائمۃ بامر اللہ لا یضرہم من کذبہم ولا من خذلہم حتی یاتی امر اللہ وہم علی ذالک (بخاری، کتاب التوحید)	میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو پکڑ کر قائم رہے گا، اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنیوالے اس کو کچھ نقصان نہ پہونچا سکیں گے، یہانتک کہ قیامت آجائے گی۔
لا تزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لا یضرہم من خذلہم حتی یاتیہم امر اللہ وہم کذالک۔ (مسلم، کتاب الامارۃ)	میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہانتک کہ قیامت آجائے گی۔
لن یبرح ہذا الدین قائما یقاتل علیہ عصابۃ من المسلمین حتی تقوم الساعۃ۔ (مسلم، کتاب الامارۃ)	یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا، اس کے لئے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہانتک کہ قیامت آجائے گی
لا تزال طائفۃ من امتی	میری امت کا ایک گروہ قیامت تک

يقاتلون على الحق ظاهرين الى يوم القيامة. (مسلم کتاب الامارۃ)

حق پر لڑتا رہے گا، اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔

لا تزال طائفة من امتى قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم او خالفهم حتى ياتى امر الله وهم ظاهرون على الناس.

(مسلم، کتاب الامارۃ)

میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکامِ الٰہی کو لیکر قائم رہیں گے، ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہونچا سکیں گے، یہانتک کہ قیامت آجائیگی، اور وہ غالب رہیں گے،

ولا تزال عصابة من المسلمين يقاتلون على الحق ظاهرين على من ناواهم الى يوم القيامة

(مسلم کتاب الامارۃ)

مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی، اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔

لا تزال عصابة من امتى يقاتلون على امر الله قاهرين لعدوهم لا يضرهم من خالفهم حتى تأتيهم الساعة وهم على ذالك.

(مسلم کتاب الامارۃ)

میری امت کی ایک جماعت خدا کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی رہے گی، اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہونچا سکیں گے یہانتک کہ قیامت آجائے اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں[1]، اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری

[1] دیکھئے کنز العمال ج ۶، ص ۲۳۱ و ص ۲۳۵۔

تسکین خاطر کے لئے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گا، تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آیندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ادا ہوتا تھا، وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی، ایک حدیث ہے العلماء ورثۃ الانبیاء[1]، یعنی امت محمدی کے علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر ختم ہوگیا، بلکہ نبوت کے فضائل و کمالات و فرائض سے ان کے حسب استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا، اور وہ تبلیغ دین، ہدایت خلق، دعوت حق، اقامت دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفع شبہات، ابطال مبطلین اور رد بدعات وغیرہ ہیں، اور وہی کام انجام دینگے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی، تو یہ امتیں بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دینگی

کادت ھذہ الامۃ ان تکون	قریب ہے کہ اس امت کے سارے
انبیاء کلھا[2] (مسند طیالسی)	افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں۔

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامۃ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام

[1] یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعدد مروی ہے، اور محدثین نے اسی لئے اس کو معتبر مانا ہے، دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی و کشف الخفاء عجلونی، ص ۳۴۹۔ [2] مسند طیالسی ص ۳۵۴، عن ابن عباسؓ و مسند احمد و ابو یعلیٰ

صلوات اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امتِ محمدیہ سے لیا جائے گا[1]، یہ شاید اس لئے ہوگا کہ امتِ محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے، حضرت عبادہؓ بن صامت سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے "اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ۔	مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا
(مومن ۶۰)	مجھ سے مانگو، میں دعا قبول کروں گا،

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاءؑ کو حاصل تھا، اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ	اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی
مِنْ حَرَجٍ ۔ (حج ۷۸)	نہیں کی۔

اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا، اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا	ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز
لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ	امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔
(بقرہ ۱۴۳)	

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔"

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے، کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

[1] حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لتکونوا شہداء علی الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کردیا ہے۔

"شہید" اور "شاہد" کے لغوی معنی "حاضر" کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہو سکتا ہے، مثلاً اس کی حمایت اور مدد کیلئے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کیلئے، اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کیلئے، اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعوی کی تائید کیلئے، اس کو امورِ خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کیلئے، اسی لئے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان ثانوی معنوں میں حسبِ سیاق و سباق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسبِ ذیل آیتوں سے ہوگا،

۱۔ حمایتی اور مددگار کے معنی میں:

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (بقرہ ۲۳)	اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ (کہ قرآن کا جواب لائیں)

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل ۸۸)	اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

۲۔ ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (حج ۱۷)	اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

اس معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

۳۔ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (مائدہ ۱۱۷)	(حضرت عیسٰی فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک ان میں رہا، نگراں رہا،

۴۔ گواہ اور دعوی کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ (نساء ۴۱)	بھلا اس دن کیا حال ہوگا، جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔

۵۔ امور خیر کی تعلیم، یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ ۱۴۳)	اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو، اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۱۰)	قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے، وہ ہر نبی کے دعویٰ کی شاہد، حامی، مددگار اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگراں کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا کہ دین الٰہی کامل ہو چکا، پیغام الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض اُمتِ محمدیہ کے سپرد ہوگیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی

تبلیغ، نظام عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے، رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاءؑ کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہو گی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ بلائے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے ہاں! میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انھوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ میرے پاس تو کوئی ڈر سنانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا، تمہارے دعوی کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے، محمد اور ان کی امت، تو یہ نوح کی شہادت دیں گے، یہ ارشاد فرما کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی" وکذالک جعلناکم امۃ وسطا الخ (یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو) (صحیح بخاری تفسیر سورۂ بقرہ)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہو گی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جزء ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی

صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورۂ حج میں سورہ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۝ (حج ۷۸)	اسی اللہ نے تم کو (اے امت محمدیہ) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی تمہارے باپ ابراہیم کا دین اسی نے تمہارا نام مسلم پہلے رکھا، اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَّسَطًا (عادل و معتدل امت) خَيْرَ اُمَّةٍ (سب سے بہتر امت) هُوَ اجْتَبٰكُمْ (تم کو خدا نے چنا ہے) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی، برتری اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ وصف اجتبٰکم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اسکا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو قیامت تک کیلئے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا، آپ کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد رہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ تابہ قیامت امت محمدیہ کا فریضہ ہے، یہی بعض علمائے محققین کی

اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حسب ذیل فرمائی ہے،

"تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے، کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے، جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے، تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔"[1]

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے، اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہونچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پاکر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (جمعہ ۲)	وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا۔

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران ۱۱۰)	قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو۔

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

[1] باب حقیقۃ النبوۃ۔

فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ۔	تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بناکر بھیجے گئے ہو، اور دشواری پیدا کرنے والے بناکر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے، اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے، اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع میں اخیر حکم:

فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ۔	میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے، وہ اس تک پہونچا دے جو یہاں موجود نہیں،

صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک کے لئے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کیلئے یہ جاری و ساری ہے، فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہونچاتا چلا جائے، ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے:

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْھُمْ طَائِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَیْھِمْ لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ۔ (توبہ ۱۲۲)	تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے۔

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی۔

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گذر چکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے

فرمایا ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں،
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ	بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے
بِاللّٰهِ۔ (آل عمران ۱۱۰)	ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ اس امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے، بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لئے سرفروشی کرے، اور اسی لئے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے،

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ	اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی
اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ	اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔	بُرے کاموں سے منع کرے، اور یہی
(آل عمران ۱۰۴)	لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کے آغوش میں اپنا نیا خون لے کر آئیں، اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہو گئی، اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا، مگر ان شاء اللہ یہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی۔

اِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۔

(توبہ ۳۹)

اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمھاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو خدا کے پورے فرماں بردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہونچا سکو گے۔

پھر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۔

(مائدہ ۵۴)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے، اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہو گی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہار حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۝

(حج ۷۷-۷۸)

مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو، اور نیک کام کرو، تاکہ فلاح پاؤ اور خدا کی (راہ) میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے، اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی، (اور تمھارے لئے) تمھارے باپ ابراہیمؑ کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمھارا نام مسلمان رکھا تھا، اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تاکہ پیغمبر تمھارے بارے میں شاہد ہوں، اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو، اور زکوٰۃ دو، اور خدا کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمھارا دوست ہے، اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔

ان آیتوں سے اس شاہد امم اور مجتبائے عالم امت کے حسب ذیل آثار و علامات ہیں،

۱۔ ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی۔

۲۔ ادائے زکوٰۃ پر عامل۔

۳۔ ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط۔

۴۔ رکوع و سجود و عبادتِ الٰہی کی خوگر۔

۵۔ امورِ خیر پر حریص۔

۶۔ راہِ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی۔

امت محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی ان شاءاللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا، جو اس کی بقاء اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لئے کسی نون کو چلانے اور پھیلانے کے لئے ایک قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ کی ضرورت طرت انسانی کا تقاضا ہے، اسی لئے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے کوئی سی جماعت نہیں بتائی جا سکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو۔ انسانی گروہ ب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا، اور اس کی زبان ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا دھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار ی، تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاؤں نے س عزت اور شرف کو اپنی خدمت گذاری کا صلہ سمجھنے کے بجائے اپنے غرور استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا، یا مافوق بشر قوی سے اپنے کو متصف قرار دیا، س خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا، جن کی جا ان کی رعایا پر فرض تھی، ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی، ئی کوئی سورج دیوتا کا نور نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا، اور دیوتاؤں کے اوتار ور قوت ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے، اور مصر کے فرعون اپنے کو رَعْ یعنی سورج یوتا کے اوتار کہتے تھے، ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ لیہ السلام کے زمانہ میں اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا)

بننے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اسی لیے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغپور (خدا کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا، یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو خدا کا اوتار کہتے تھے، ہومر کے بادشاہ (یونان کے) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے[1]۔ اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے، یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا خدا ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رولس اور اس کا بھائی دونوں ستارۂ مریخ کی اولاد تھے[2]، ولادت مسیح کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے، اوران کی پرستش کی جاتی تھی[3]، یہودیوں میں حضرت داود علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو خدا کے کاہن اور خدا سے الہام پاکر خدا کے نام پر حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں، ان ہی سب کے پیش نظر ارباب تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں، مثلاً اوتاری، شخصی، زعیمی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

۱۔ اوتاری سے مفہوم تھیاکریسی ہے، یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود خدا یا خدا کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم، مضمون یونان [2] تاریخ روما، ص ۳، دار الترجمہ حیدر آباد دکن [3] ایضاً ص ۴۲۹۔

۲۔ شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت واثر سے حکومت کرتا ہو، اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گذرے ہیں۔

۳۔ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے، جیسی کبھی یونان میں تھی۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دیکر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کردے تو یہ حکومت دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۵۔ زعیمی (آمرانہ) وہ طرز حکومت ہے، جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمایندہ کی حیثیت سے ملک پر حکمراں ہوتا ہے، مثلاً جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمایندہ تھے۔

۶۔ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لئے کسی مدت معینہ کیلئے اپنا ایک رئیس منتخب کرلیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے، اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی اصل ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیر اعظم پر ہوتی ہے، اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار

مختلف شعبوں کے سکریٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہو
اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے، جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کے نمائند
پر مشتمل ہے،

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ
اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امر
کیلئے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کئے ہیں۔

اسلام کے طرز حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جب
زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے، اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے
کوشش کی گئی ہے، سیاسیین یورپ نے اسلامی خلافت کو مذہبی یا اوتار
حکومت کا خطاب دیا، پرانے علماء جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں، اس کو شخص
بتاتے ہیں، نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا، پھ
جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ
کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے، اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأ
کی گئی، اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) قوت پکڑ رہ
اس کو زعیمی حکومت ثابت کرنے کیلئے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم
اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں، ان کی روشنی میں اسلامی حکوم
کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری ا
زعیمی حکومتوں کے خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لئے اہل نظر اپنے ا
مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ا
طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا، ا

اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے، وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے خالی ہے، اسلئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی، کبھی زعیمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و خال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے، نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے، جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لئے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ﷺ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے، اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل وعقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے، اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کی جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں، اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے، اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے، اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کیلئے

ضروری ہے' اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جا سکتا ہے' لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات حکومت میں سے کوئی ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی' اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے' اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ' ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین' ان کے فرائض و حقوق' ان کے انتخاب' اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں' اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزء کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں' بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے' اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے' اور خدا کے بنائے ہوئے اور تعلیم کئے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے' اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہیں کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں' لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے' تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں' عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں' پھر تیسرا اور چوتھا قانون' پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی

روک تھام کیلئے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں، اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں، اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی ہر کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت، زمانۂ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے، اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے، جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ یا سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جارہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے، اسی طرح اس اسلامی نظام حکومت کی برقراری کے لئے بھی سب سے پہلے اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کے اجراء کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف ۶) حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔

آیت بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لئے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں، اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری و ساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنھوں نے نمرود و فرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہہ ان سلاطین عالم کو اس لئے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں اسلام نے شک و شبہہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی، زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے، اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے،

اس معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ۴۰)	حکم نہیں، مگر اللہ کا۔
اَلَا لَہُ الْحُکْمُ وَھُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ۔ (انعام ۶۲)	ہاں! اسی کیلئے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔
لَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ (قصص ۷۰)	اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کیطرف لوٹائے جاؤگے۔

امر تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے وہ زمین، آسمان اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کرسکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے اور نہ ان کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کرسکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سب ہی سر افگندہ اور ناچار ہیں، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اسکو اسی دلیل سے خاموش کردیا، فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ (بقرہ ۲۵۸)	تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہوگیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ۔ (آل عمران ۲۶)	اے اللہ سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے۔

اس لئے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام تکوینی کیطرح

اس کے احکام تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ انکو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لئے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں، اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجراء اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیئے ہیں، ان کے تتبع سے اہل علم اور مجتہدین دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکام الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہ اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہئے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب مترتب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں، مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لئے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے، اس لئے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جسکو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورۂ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔	حکم صرف اللہ کے لئے ہے ۔
(انعام ۷۰ و یوسف ۶۷)	
۲۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۔	ہاں اسی اللہ کے لئے ہے پیدا کرنا
(اعراف ۵۴)	اور حکم دینا ۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادثِ عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورہ انعام اور سورۂ یوسف میں، سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے :

مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ ۔	جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے ۔
(انعام ۵۷)	

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے جب یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں، کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ چاہتا ہے ۔

وَمَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۔	اور خدا کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے، (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیئے ۔
(یوسف ۶۷)	

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ	بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ	سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں
اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ	پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے
یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ یَطْلُبُہٗ	شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب
حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ	اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے، اور
وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ	سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں
بِاَمْرِہٖ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ	کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے
تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔	حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کیلئے
	خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی
	خوبیوں کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ
(اعراف ۵۴)	جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ اَمر اور حُکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعوی پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر صرف اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ (مریم ۴۴) شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشادِ الٰہی ہے :

اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ (یٰسین ۶۰) یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو ۔

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیاء اور ائمۂ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکامِ الٰہی کی تبلیغ، اجراء اور تنفیذ کے لئے حکمِ الٰہی کے تحت ہے، ارشادِ الٰہی ہے

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (نساء ۵۹) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو ۔

اولوالامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام، خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے، اور رسول کی اطاعت بھی احکامِ الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے :

وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۔ (نساء ۸۰) اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی ۔

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے :

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ۔ (نساء ۶۴) اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے ۔

یہود اور نصاریٰ نے احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا، اور ان کا حکم حکمِ خدا سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا مجرم

قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (توبہ ۲۹)

اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انھوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ (توبہ ۳۱)

انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو، حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیوں کہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہل کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ

اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی

شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (آل عمران ۶۴)

عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی رضؓ بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ نے ان کے سامنے سورہ توبہ والی آیت مذکور پڑھی، تو عدی نے کہا "وہ ان کو معبود نہیں بناتے" فرمایا کیوں نہیں، انھوں نے ان کے لئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انھوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں فذالك عبادتهم اياهم[1]، ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے، تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے[2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ خدا کا ہے، اور اسی کا نام وضعِ حکم ہے، اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکمِ خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الٰہی کی سختی سے بچنے کے لئے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لئے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر و توبیخ فرمائی اور انکے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا، چنانچہ بعض اصولی احکامِ عدل و انصاف اور طریقِ اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

[1] تفسیر ابن کثیر، [2] ترمذی تفسیر آیت توبہ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ	کیا تونے ان کو نہیں دیکھا جو گمان
اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ	کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ	اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا'
اَنْ یَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ	ایمان لاچکے ہیں' وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت
وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ۔	کو اپنا حاکم بنائیں' حالانکہ ان کو حکم
(نساء ۶۰)	دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے' "کل معبود من دون اللہ"۔ اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں' جادوگروں' اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے' اس لئے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دیکر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے' وہ طاغوت ہے' قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے' اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبودِ باطل لیا گیا ہے'۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے' اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ	جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔
(مائدہ ۴۷)	

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام **حدود** ارشاد فرمایا ہے' حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تِل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے' اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں'

اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے، قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء، اور طلاق میں احکامِ الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔	یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں، جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔
(طلاق ۱)	

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔	یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریگا اور اللہ کی حدود سے آگے بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں ڈالیگا جس میں وہ ہمیشہ رہیگا، اور اس کیلئے بڑی ذلت کی سزا ہے۔
(نساء ۱۳-۱۴)	

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے، اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔

قانون وشرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے، اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے

مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلا سندِ الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرلے تو اس کا نام "افتراء علی اللہ" خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ	اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے
الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَّهٰذَا	(حلال و حرام) بتاتے ہو انکی نسبت
حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ	نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ
الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ	تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ
عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ	(دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے
مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ	اور ان کے لئے دردناک عذاب
اَلِيْمٌ۔ (نحل ۱۱۶-۱۱۷)	ہے۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لئے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیشین گوئی فرما دی کہ جو لوگ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر وہ انکے لئے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکامِ الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے، اور اس حیثیت سے آپ کا ہر حکم حکمِ الٰہی ہے لیکن حکمِ الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپؐ نے ایک چیز کو اپنے لئے حرام قرار دیا تو عتاب الٰہی آیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ	اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے
اللّٰهُ لَكَ۔ (تحریم۔۱)	جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کردے مگر جب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ کو منع فرما دیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے، ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لئے مخصوص نہ ہو امت کے لئے، حکم الٰہی کے تحت شرع کا حکم رکھتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپ کے اس ترک سے امت اپنے لئے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذن الٰہی کے بھی حقِ تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لئے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعت الٰہی کا مبلّغ اور قانونِ ربانی کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ۔	اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔
(توبہ ۲۹)	

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے، وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلّغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علم عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضعِ قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب

اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لاحاکم سوی الله تعالیٰ ولاحکم الا ماحکم به، ویتفرع علیه ان العقل لا یحسن ولا یقبح ولا یوجب شکر المنعم وانه لاحکم قبل ورود الشرع۔ (۱،۱۱۳ مصر)

جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا، اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے، اور یہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون قانون ہے، اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے روسے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عقاب کا حکم عائد کیا جاسکے، نہیں ہوسکتا، اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے، علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاکم لاخلاف فی انه رب العلمین۔ (ص ۲۰۸)

اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگار عالم ہے۔

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں:

"حسن و قبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ

اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں ایک کمال کی صفت ہے، اور دوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے، اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے صرف شرع پر موقوف نہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور اس فیصلہ کے لئے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔"

(ص ۹۰، بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، ہے یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلکِ حق ہے، مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

"حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت کے موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے

نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جا سکتا ہے یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو بُرا فرمایا وہ بُرا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا بُرا ہوتا، اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے، لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے، کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا" (المقالۃ الثانیہ فی الاحکام)

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

"اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے، اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے، اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون و حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے، کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ عقل بعض احکام الٰہی کو جان سکتی ہے، چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو، اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔"

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے:

"اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہونچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہونچی ہو، تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے، اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکم الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا"

(ص ۱۶، ارشاد الفحول، مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ کا وہ قول فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لئے ہے پیدا کرنا اور حکم دنیا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے، تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ اتصاف امر و نہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا، اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورۂ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں۔ (ص ۱۲)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب[1] ہے

[1] تہذیب، منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے (باقی ص ۱۹۲ پر)

اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرمادیا ہے
اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ "قانون کا واضع
درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے" یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لئے ثابت نہیں ہے، جو کچھ
اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے وہ تمامتر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے،
عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پالیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ
عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے
ماہرین قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں
وضع قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر
اور واضع شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع
تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی
ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لئے
کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول،
اور کلیات، اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے
ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں
رہتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، تغیر و تبدل اور تجدد
یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے،
جو انھیں کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی
بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پُرانے اور غیر متبدل ہیں،

(باقی حاشیہ ص ۱۹۱) دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لئے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا، اور اب بندوق سے، تمنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے، لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہونچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، اسکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آجائیں، یا نقصان پہونچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نگاہ رکھتے ہوں، آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہل اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا

صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزئیہ فلاں اصول
کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہاء نے فتاویٰ کا
پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا
جواب دیا جاسکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی
عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔